ذخیرۂ حسنین
کتب / رسائل
مفت کے مشورے
سرور جمال

مفت کے مشورے

سرور جمال

یکے از مطبوعات پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سیوان
(بہار)

یہ کتاب بہار اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی

سال اشاعت : ۱۹۸۱ء

کتابت : سوز دانا پوری

طباعت : نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد (یوپی)

تعداد : ۱۰۰۰

قیمت : دس روپے

ملنے کے پتے

پا پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ سیوان (بہار)

کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ

بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ

عظیم الشان بک ڈپو سلطان گنج پٹنہ

مکتبہ جامعہ اردو بازار دہلی

کتاب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار دہلی

دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ

ایم بشیر اینڈ سنز لورچیت پور روڈ کلکتہ۔

سرور جمال

پہلی دسمبر ۱۹۳۶ء کو سیوان (بہار) میں پیدا ہوئیں۔ گھر کا ماحول ادبی تھا۔ بچپن اسی ماحول میں گذرا۔ شادی کے بعد بھی یہ ماحول قائم رہا۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے۔ کیا۔ فرسٹ پوزیشن حاصل کی اور گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ آج کل ودیا بھون مہلا مہاودیالیہ سیوان میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ ایک ہائی اسکول (داؤد میموریل اردو گرلس اسکول سیوان) اپنے والد کے نام پر قائم کیا جس کی بانی و سکریٹری ہیں۔

ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہندوستان و پاکستان کے چوٹی کے ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اب تک دو مجموعے: "مشق ستم" و "معونت کے مشورے" منظر عام پر آچکے ہیں۔ "مشق ستم"، کو یوپی اردو اکاڈمی کے ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔ ٹیگور کی کہانی "کابلی والا" کا ترجمہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کے لئے "حکیم منقیٰ"، "تیس مار خاں" اور "راجہ بنسی" کی کہانی اردو میں اور ہندی میں "بن ماتا"، "بہار کی لوک کہانیاں" شائع ہو چکی ہیں۔

آپا کے نام ——————

آپ بیتی سے آپ بیتی تک

سلمیٰ بہن کا اصرار ہے اپنی "آپ بیتی" بھیجیے، مضمون نگار کو کیسے کیسے امتحانوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ ایڈیٹر لوگ طرح طرح کے نمبر نکالتے رہتے ہیں، کوئی صاحب "افسانہ نمبر" نکال رہے ہیں، کوئی "ناولٹ نمبر" کسی نے "سیلِ قہقہہ" نکالا، تو کسی نے "طوفانِ اشک نمبر" ہم ان طوفانوں اور سیلابوں میں ڈوبتے کسی نہ کسی طور ان امتحانوں سے گذرتے رہے اور گذرتے رہیں گے لیکن سلمیٰ بہن کا خط پا کر ایسا لگا کہ

ع :- ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

پہلا خط پا کر میں نے سوچا ٹال جاؤں اور ٹال گئی، لیکن جناب انھوں نے تو خطوں کی ڈاک بٹھادی، تب مجھے اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا، اور خیال ہوا کہ صاحب ہم بھی کوئی چیز ہیں، لہٰذا اپنی زندگی پر ایک نظر ڈالی، لیکن اس میں نہ تو کہیں "آپ" نظر آیا اور نہ "بیتی"۔ بہت چھان بین کی تو یہ خاکہ نکلا :

"اس خاکسار کی اولین "بیتی" پہلی دسمبر ۱۹۳۸ء کا وہ حادثہ تھا جس نے مجھے عالمِ بالا سے عالمِ وجود میں لا پھینکا۔ یقین جانیے یہ "بیتی" وہ تھی جس میں "آپ" کا کوئی دخل نہیں تھا، لیکن جیسے تمام عمر گھسیٹنے کے ذمہ دار ہم قرار دیے گئے، بچپن عام لڑکیوں سے کچھ ہٹ کر گذرا۔ سنا ہے کہ لڑکیوں والی کوئی بات مجھ میں نہ تھی، کھیل تمام لڑکوں والے پسند تھے۔ کرکٹ، فٹ بال، کبڈی، بیڈمنٹن جیسے کھیلوں سے دلچسپی تھی۔ اُچک پھاند، پیڑوں پر چڑھ چڑھ کر باغ کے کچے پکے پھل توڑ کر کھانا کم اور برباد زیادہ کرنا، اپنا دل پسند مشغلہ رہا۔ شرارتیں کیں تو خوب کیں، پیٹے تو خوب پیٹے۔ اماں طرح طرح کی

سزائیں تجویز کرتیں، اور میں نت نئی شرارتیں اور کھیل ایجاد کرتی، غرضیکہ کھیل کود کر، شرارتیں کرتے، پڑھنے سے جی چراتے، مار کھاتے، سزائیں پاتے، زندگی کا وہ بہترین دور بھی گذر گیا۔

ہوش سنبھالا تو ہر طرف علم و ادب کا چرچا سنا۔ "نشاط افزا" کے بیشتر کمروں میں کتابوں کے انبار دیکھے۔ والدہ کے تخت پر، میز پر، مسہری کے سرہانے پینتانے، غرض کہ ہر اس جگہ پر جہاں ان کے لیٹنے، بیٹھنے، سونے، یہاں تک کہ کھڑے ہونے یا ٹہلنے تک کا امکان ہو سکتا تھا، وہاں دو چار کتابوں کی موجودگی یقینی تھی۔ باہر والد صاحب کے پاس شاعروں، ادیبوں، عالموں وغیرہ کا جمگھٹا رہنا۔ ہر ہفتے چھوٹی بڑی علمی و ادبی نشستیں ہوا کرتیں۔ کبھی بڑے پیمانے پر مشاعرہ ہو رہا ہے، کبھی وعظ تو کبھی میلاد شریف، ایسے ماحول میں پلی اور بڑھی، ایسے ماحول میں لکھنے پڑھنے کا شوق نہ ہونا غیر فطری سی بات ہے۔

میرے ماموں جان مرحوم مولوی محمد عزیز صاحب کا نام نامی اہلِ بہار کے لئے کوئی نیا نہیں، خصوصاً علم و ادب سے تعلق رکھنے والوں کے لئے۔ سیوان میں کسی طرح کا مشاعرہ ہو یا ادبی تقریب، باہر سے آنے والے مہمان ان کی رہائش گاہ "روح افزا" ہی میں مقیم ہوتے۔ میں نے بہت سے بڑے شاعروں، ادیبوں اور سیاست دانوں کو وہیں پہلی بار پسِ پردہ دیکھا، جو سچ پوچھئے تو اردو و فارسی کی تعلیم میں نے اپنے والد مرحوم حاجی محمد داؤد صاحب سے حاصل کی، مجھے اس جگہ پر پہنچانے والی یہی دو عزیز ہستیاں ہیں، جو افسوس، کہ اب اس دنیا میں نہ رہیں۔ میری چھوٹی سے چھوٹی تحریر پر یہ دل سے خوش ہوتے اور میری حوصلہ افزائی کرتے رہتے۔ میں نے بہت بچپنے سے "کھلونا" میں لطیفے وغیرہ بھیجنا شروع کر دیئے تھے۔

میری پہلی تخلیق بھی کھلونا ہی میں چھپی تھی، یہ ایک چھوٹا سا مضمون تھا لیکن جس کے چھپ جانے سے مجھے ایسا لگا کہ مجھے دو جہان کی دولت مل گئی، سچ پوچھئے تو جو خوشی مجھے اس مضمون کے چھپنے سے ہوئی تھی، وہ پھر نہ ہو سکی، پھر بعد میں میں زیب النساء عصمت،

حور اور بانو وغیرہ میں سرور داؤد کے نام سے مضامین بھیجنے لگی جو باقاعدگی سے چھپتے تھے

سیوان میں اس زمانے میں کوئی گرلس اسکول یا کالج نہیں تھا، لڑکوں کے اسکول اور کالج تو تھے، لیکن مخلوط تعلیم کو ہمارے گھر والے اچھا نہیں سمجھتے تھے، والد صاحب باہر بھیج کر پڑھانا چاہتے تھے، لیکن والدین کی صرف دو ہی لڑکیاں ہونے کے جرم میں اماں مجھے اتنے لمبے عرصے کے لئے گھر سے باہر بھیجنے پر کبھی راضی نہیں ہوئیں۔ لہٰذا بی اے تک میں نے پرائیویٹ پڑھا اور وہ بھی پردے کے ساتھ۔ اس پردے پہ مجھے اپنی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔

سیوان ڈی۔ اے۔ وی کالج میں ایک کل ہند مشاعرہ ہوا تھا اور حسب معمول باہر کے شعرائے کرام میرے ہی یہاں ٹھہرے ہوئے تھے، دوسرے دن ایک چھوٹا اور مخصوص مشاعرہ میرے یہاں بھی تھا۔ ہم لڑکیوں کو چوں کہ باہر جانے کی اجازت نہیں تھی اس لئے ہم اپنے روایتی طریقے سے ہال کے اندرونی دروازے سے لگے پردے کے پیچھے سے شاعروں کا کلام کم سن رہے تھے اور ریمارکس زیادہ پاس کر رہے تھے۔ لڑکیوں کی تعداد کے حساب سے دروازہ کافی چھوٹا پڑ رہا تھا، لڑکیاں ایک دوسرے پر لدی پڑ رہی تھیں۔ ہر ایک کی کوشش تھی کہ وہ آگے ہو جائے۔ اس کشمکش میں ایک چھر کی آواز آئی اور پردہ پھٹ گیا، اس کے ساتھ ہی مختلف آوازوں اور موٹی مہین چیخوں کے ساتھ سننے والیاں شاعروں پر اور شاعر مشاعرے پر گرے۔ آج بھی جب افراتفری کا وہ عالم اور ابا میاں و ماموں جان کے غصہ کو یاد کرتی ہوں، تو بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔

اسی طرح ایک بار ایسا بھی ہوا کہ ہم سب پکنک کے لئے شہر سے باہر اپنے گاؤں والے باغ میں گئے تھے، گاؤں کی آزاد فضا میں دن بھر ہم خوب شرارتیں کرتے رہے اور اودھم مچاتے رہے۔ سامنے ہی ایک ریلوے لائن تھی۔ جھولا جھولنے اور کود پھاند کے علاوہ ہماری ایک ایکٹی ویٹی یہ بھی تھی کہ جب کوئی ٹرین سامنے سے گذرتی میری ہمجولی لڑکیوں کا

گروپ سامنے آکر مسافروں کو ٹاٹا کرنے کے ساتھ ہاتھ کے اشاروں سے ان کی ہوٹنگ بھی کرتا جاتا۔ مسافر کھڑکی سے سر نکالے ہماری حرکتوں پر ہنستے لیکن ایک ٹرین کے ساتھ ہماری بدقسمتی بھی چپکی ہوئی سفر کر رہی تھی۔ ہمارے ایک بڑے ہی کٹر اور جدید قسم کے بزرگ اس ٹرین سے سفر کرتے ہوئے ہمارے گھر یعنی سیوان جا رہے تھے۔ ہماری اس شرارت پر وہ آگ بگولہ ہو گئے اور انجن بنے ہوئے گھر پہنچے۔ گھر واپسی پر ہماری جو درگت بنی اس کا تصوّر آپ خود کر سکتے ہیں۔

۱۱ر فروری ۱۹۶۶ء کو میری کتاب زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ پھر ایک حادثہ سے دوچار ہوئی۔ زندگی نے ایک کروٹ لی اور میں سرور داؤد سے سرورجمال ہو گئی۔ خوش قسمتی سے شادی کے بعد بھی مجھے ویسا ہی ماحول ملا فرق صرف اتنا تھا کہ شادی سے پہلے جو چیزیں اور چہرے پردے کے پیچھے سے دیکھا کرتی تھی وہ اب سامنے سے دیکھتی ہوں۔ میرا شوق نہ صرف برقرار رہا بلکہ اس میں نکھار اور توانائی آگئی۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد چند سال تک اپنے وطن سیوان میں شریمتی راج بنستی دیوی گرلس ہائی اسکول میں ہیڈ مسٹریس کے فرائض بھی انجام دیئے۔ پُر لطف بات تو یہ ہے کہ ماسٹر (مسٹریس) ہو جانے کے بعد ماسٹر کی ڈگری لی اور ماسٹر ہو جانے کے بعد ماسٹری چھوڑ دی۔ ۱۹۶۹ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور فرسٹ کلاس فرسٹ آنے کے پاداش میں گولڈ میڈل میرے سر منڈھ دیا گیا۔

ان دنوں ہر طرف سے فراغت ہے اور ہوم سائنس میں کئے گئے پریکٹیکل کی مشقیں کیا کرتی ہوں، مصروفیت بڑھ گئی ہے، اس لئے لکھنے کی رفتار میں کافی کمی آگئی ہے، پھر بھی موقع ملنے پر کچھ نہ کچھ لکھ ہی ڈالتی ہوں۔

لیجئے آپ بیتی کی پہلی قسط حاضر ہے، باقی کچھ اور بیتنے پر!

★★

مُفت کے مشورے

یہ کوئی انگلینڈ یا امریکہ تو ہے نہیں جہاں خیال رکھتا ہو مشورے حاصل کرنے کے لئے روپیہ خرچ کرنا ہوتا ہے۔ کسی سے ملنے یا باتیں کرنے کے لئے ہفتوں پہلے اپوائنٹ منٹ کرنا پڑتا ہو، یہ جناب ہندوستان ہے ہندوستان، جہاں رشتہ داروں سے زیادہ ملاقاتی اور ملاقاتیوں سے زیادہ احباب ہوتے ہیں، اور جہاں یہ مقولہ بُری طرح فیل ہوجاتا ہے کہ :-

" واقف کار زیادہ سے زیادہ بناؤ لیکن دوست صرف چند رکھو" اور ان سب کے مقابلہ میں جو چیز ہندوستان میں بکثرت پائی جاتی ہے وہ ہے "مفت کا مشورہ" مفت، بالکل مفت، ایک دم مفت اور قطعی مفت مشورے دینے والے ہر قسم اور ہر عمر کے حضرات اور خواتین سے ہمارا آئے دن پالا پڑتا رہتا ہے، کوئی صورت نہیں، کہ ہم ہر ایک کے قیمتی اور فاضل مشوروں سے جان چھڑا سکیں۔

سچ پوچھیے، تو مشورہ دینے میں یہ بڑے ہی فراخ دل ہوتے ہیں۔ آپ ان سے خوش ہوں یا نہ ہوں، لیکن یہ عام طور پر آپ سے ناخوش رہا کرتے ہیں کہ آپ ان کے ذاتی مشوروں سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھاتے اور نہ اُن کی صلاحیتوں سے مستفیض ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

مشورے دینے والے دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جو وقت بے وقت ہر جگہ اور ہر موقع پر اپنی قیمتی رائے دینے کو تیار رہتے ہیں۔ دراصل یہ پیشہ ور مُشیر ہوتے ہیں، لیکن مشورے ان کے بالکل مفت ہوتے ہیں۔ اِن کے

مفت مشورے اکثر جان لیوا ثابت ہوتے ہیں جن پر بھولے سے بھی عمل کرنے کے بعد زندگی بھر قیمت چکانی پڑتی ہے، یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے مشورے پر چلنے کی چبھن زندگی بھر دل پر کچوکے لگاتی رہتی ہے۔ مثلاً ایک فاضل مشورہ دینے والے نے فرمایا:

"اے یہ کیا گرم گرم پانی پیتی رہتی ہے۔ برف دروغہ کے چکر میں پڑنا بھی کیا، بس سیدھے سے ایک ریفری جریٹر لے لو۔"

ان کے نزدیک تو بہت ہی سستا نسخہ تھا، بتا کر چلے گئے، ان سے یہ بھی تو نہ ہوا کہ اس مہنگائی میں ریفری جریٹر خریدنے کے مالی پہلو پر غور کرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ "آئس باکس" خریدنے کی رائے دیتے۔

اب ذرا ریفری جریٹر کے دلکش تصوّر کو ذہن میں لائیے۔ جب بھی چلچلاتی دھوپ اور لو میں پسینہ پسینہ ہونے کے بعد آپ کا دل ٹھنڈے پانی یا آئس کریم کو چاہے گا تو ان کا مشورہ آپ کو یاد آئے گا اور زندگی بھر ریفری جریٹر کی یاد یا کمی آپ کو ستاتی رہے گی۔

مشورہ دینے والوں کی دوسری تکلیف دہ قسم وہ ہے جو وقتی طور پر کسی تکلیف سے متاثر ہونے کے بعد آپ کو کسی نہ کسی تکلیف میں مبتلا کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں مثلاً آپ کا کوئی اچھا بھلا ملاقاتی آپ کے شاندار پانچ منزلہ عمارت کی ساری سیڑھیاں طے کر کے جب ہانپتا کانپتا اوپر پہنچے تو مکان کی تعریف کے بعد آپ کو بتائے کہ اتنے عمدہ مکان میں آپ نے بس ایک کسر چھوڑ دی ہے اور جب آپ سوالیہ نشان بن جائیں تو بڑی سادگی اور بھولے پن سے وہ مشورہ دیں۔

"آپ اس میں لفٹ کیوں نہیں لگوا لیتے۔"

آپ کے مہربان تو مشورہ دے کر چلتے بنیں گے لیکن زندگی بھر زینے اترنے چڑھنے کے ساتھ ہر بار ان کا "لفٹ" کا مشورہ آپ کا تعاقب کرتا رہے گا اور ہمیشہ آپ کو رونا رہے گا کہ مفلسی کے سبب ایک لفٹ تک نہ لگوا سکے۔

ان مشورہ دینے والوں کے آئے دن کے مشوروں سے تو میرے کان پک گئے۔

اتفاق سے ایک بار امتحان میں فیل ہو گئی، اب جو پرسا دینے والوں کا تانتا بندھا تو دل ہی دل میں خدا کا شکر بجا لائی، کہ اگر غلطی سے پاس ہو جاتی تو اتنے لوگوں کو مٹھائی کھلانے کے لئے خود حلوائی بننا پڑتا۔ جو آتا وہ فیل ہونے پر اظہارِ افسوس تو کم کرتا اور پاس ہونے کے مشورے زیادہ دیتا۔ جن بزرگوں نے ہمیں دن رات محنت سے پڑھ کر اگلا امتحان پاس ہونے پر زور دیا تھا، ان میں سے زیادہ تر کی سات پشتوں میں بھی کسی نے کتاب کی شکل نہیں دیکھی تھی، اور ان کی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ خود گھر کے روزمرّہ کے سودا سلف اور دھوبی کے کپڑوں تک کا حساب نہ دیکھ سکتے تھے، بلکہ بعض انگوٹھا لگانے والے تک ہمیں مشورہ دے رہے تھے۔

ایک دن میں اپنا غرارہ جو سینے بیٹھی، تو پڑوس کی بی آمنہ ٹپک پڑیں، پہلے تو انھوں نے کپڑے کا بغور معائنہ کر کے اس میں نقص نکالا، ہمارا جی ہی تو جل گیا، اس کے بعد کتر بیونت اور سلائی کے بارے میں اپنی رائے دیتی رہیں۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ وہ سلائی کے بارے میں قطعی ناواقف ہیں، بس ان کے ذہن میں دو چار فلمی غرارے تھے، جن کے بل پر وہ اپنی بے پناہ قابلیت کا رعب مجھ پر جھاڑ رہی تھیں۔

مگر سب سے زیادہ غصّہ تو ان پر آتا ہے، جو کھانے پینے کی چیزوں میں اپنا مشورہ ملا کر کھانے پینے کا ناس مارتے ہیں، مثلاً ہمیں آلو، مٹر اور ٹماٹر پسند ہیں تو وہ لوکی، ترئی اور بھنڈی کے افادی پہلو پر غور کرنے کا مشورہ دیں گے، اگر ہمیں چاول بھاتا ہے تو وہ اصرار کریں گے، کہ روٹی کھایا کیجئے۔ اس قسم کے مشورے لاکھ اس کان سے سن کر اُس کان سے اڑا دیں، مگر اس سے

ہماری "جنرل نالج" میں جو اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ کس ترکاری میں وٹامن "ب" ہے اور کس میں "ٹ" غرضیکہ ٹ ث ج چ ح سبھی طرح کے وٹامنوں سے پوری پوری واقفیت ہو جاتی ہے اور گیہوں بشرطیکہ کنٹرول میں آنے کی وجہ سے سڑ نہ چکے ہوں، چاول سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ حالاں کہ گیہوں کے بارے میں ہم اتنا علم ضرور رکھتے ہیں کہ گیہوں کھانے کے بعد ہی حضرت آدم علیہ السلام اس دُنیا میں پہنچنے کے مرتکب ہوئے تھے، اور اب ان کا گیہوں کھانے کا مشورہ خدا جانے ہمیں کس جہنم میں لے جائے۔

ہمارے بعض ملاقاتی تو مشورہ دینے میں اس قدر حاتم واقع ہوئے ہیں کہ ہمیں طرح طرح کے مشورے دینے کی فکر میں دن رات دُبلے اور بیمار رہتے ہیں اور وہ گھر کے ہر معاملے کو اپنا معاملہ سمجھتے ہیں، اگر گرمیاں گذارنے کے لئے ہم کشمیر جانے کو بالکل ٹکٹ بہ دست ہوں، تو وہ اصرار کریں گے، کہ بھئی کشمیر میں کیا رکھا ہے، نینی تال یا شملہ جاؤ، اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے پہاڑ اور پہاڑی تو کیا، کوئی ٹیلہ تک نہیں دیکھا۔ لیکن جمہوریت میں آزادیٔ رائے، اور صحت مند حزبِ مخالف کا ہونا ضروری ہے، اس لئے وہ عادت سے مجبور ہو کر اختلاف برائے اختلاف کی خاطر کشمیر پر شملہ کو ترجیح دے رہے ہیں۔

کچھ بھلے مانس اپنی بات اوپر رکھنے یا نبھانے کی خاطر مشورے دیا کرتے ہیں، اگر آپ نے اوشا سلائی مشین خرید لی ہے، تو یہ فوراً آپ کی ٹانگ کھینچیں گے، کہ "میرٹ" کیوں نہیں خریدی، وہ تو اس سے زیادہ اچھی ہوتی ہے، اگر آپ سینی پنکھا خرید لائے ہیں، تو وہ آپ کی جان کو آجائیں گے، کہ آپ اس کو واپس کر کے "اوشا" پنکھا لے آئیں۔

اس قسم کے مشورے دینے والوں کی اُس وقت سب سے زیادہ بن آتی ہے کہ

جب اُن کی دعا رسے ان کا کوئی دوست یا عزیز بیمار پڑ جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کے غول کے غول آپ کے غریب خانے پر گرنا شروع ہو جائیں گے، انھیں اس سے بحث نہیں کہ آپ کو محض موسمی بخار یا معمولی نزلہ بخار ہو گیا ہے، وہ کسی بھی صورت میں اسے " ٹی بی " سے کم کا درجہ نہ دیں گے، ان کی پوری کوشش یہ ہو گی کہ آپ زندگی سے ہاتھ نہ دھو سکیں، تو کم از کم صحت سے تو دھو ہی لیں۔ اس کا تجربہ مجھے پچھلی برسات میں اس وقت ہوا، جب میں موسمی بخار میں مبتلا ہو کر بسترِ علالت پر دراز تھی، جس کے چاروں طرف عیادت کرنے والوں کا صبح سے شام بلکہ رات گئے تک میلہ سا لگا رہتا تھا۔

ایک بڑی بی آئیں، تو آتے ہی انھوں نے ماتھے پر ہاتھ رکھا، نبض کے دھوکے میں کلائی پکڑ پکڑ کر ٹٹولتی رہیں، سینہ ٹھونک بجا کر دیکھا - ہماری جملہ بد پرہیزیوں کا جائزہ لینے کے لئے کمرہ کے چاروں طرف گہری نظروں سے معائنہ کیا لیکن جب کمرہ میں یا میرے آس پاس ایسی کوئی چیز تو درکنار " نمرا " تک نہ ملا، تو پھر میری شامت آئی، بولیں ــــــ

" آخر کیسے آگیا بخار ؟ کیا کیا کھایا تھا ؟ ٹھنڈے میں غسل کیا تھا ؟ کیلا کھایا تھا، یا امرود اور سیب وغیرہ کوئی ٹھنڈی چیز اس برسات میں کھائی تھی، یا شبنم میں سو گئی تھیں ؟ "

اُن کی جرح جاری تھی، اور ہم دل ہی دل میں حیران، کہ نہانا تو صحت کے لئے ضروری ہے، اور پھل صحت بخش چیز ہوتے ہیں، ان کا بھلا بیماری سے کیا تعلق، پھر بھی اقبالِ جرم کے طور پر سر ہلانا پڑا، اور انھوں نے جوابی گولہ باری کرتے ہوئے کونین مکسچر سے بھی تلخ لیکچر پلانا شروع کر دیا۔

" غضب خدا کا، تم نے بھی حد کر دی۔ گرمیوں میں نہانے کے بعد ٹھنڈے

پھل کھائے، بخار نہ آنا تو کیا گرمی دانے نکلتے۔"

دوسرے صاحب کی رگِ حکمت جو پھڑکی، تو پوچھ ہی تو بیٹھے۔

"کس کا علاج ہو رہا ہے؟"

"ڈاکٹر احمد کا!"

"اوہو، یہ بھی کوئی ڈاکٹروں میں ڈاکٹر ہے۔ حکیم اسداللہ خان کو کیوں نہ دکھایا۔ اُسے مسیحا جانو، مردہ زندہ کر دیتا ہے۔"

صبح سے اب تک یہ مشیر ہومیوپیتھک، ایلوپیتھک، آیورویدک، بایوکیمک، نیچر کیور ماہرِ طب اور ماہرِ نفسیات سے لے کر تکیہ والے شاہ صاحب تک کئی سو معالج تجویز کر چکے تھے، اور خدانخواستہ اگر میں ان میں سے کسی کا علاج کرنا بھی چاہتی، تو ان کے انتخاب میں کم سے کم ایک ہفتہ ضرور لگ جاتا، جبکہ بخار دو تین دن میں رفوچکر ہو جاتا۔

ایک صاحبہ ٹیچر، نبض وغیرہ کی تفصیل معلوم کرنے کے بعد بجائے مطمئن ہونے کے، کہ معمولی بخار ہے، شام تک اُتر جائے گا، مجھ پر برس پڑیں۔ اُن کا پارہ ایک دم چڑھ گیا، اور میں سمجھی کہ میرا بخار اُن کے چڑھ گیا، جو اس صورت میں اُترا کہ ——

"بس بس، یہی سب باتیں کچے پن کی ہیں۔ دشمن اور بیماری کو کبھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ تم کہتی ہو کہ بخار ۹۹ ڈگری ہے اور میں کہتی ہوں، کہ ننانوے کا پھیر ابرا ہوتا ہے، اس سے بچنے کے لئے ٹوٹکا ضروری ہے۔"

دوسری نے مشورہ دیا۔

"کچھ نہیں، پہلے ایکسرے کراؤ، ایکسرے!"

غرض یہ کہ رات کو جب سونے کی کوشش کی، تو نیند اس لئے غائب نہیں ہوئی

کہیں بیمار تھی، یا یہ کہ ع : "موت کا ایک دن معین ہے" بلکہ اس لئے، کہ معمولی بیماری کے خوفناک پہلوؤں نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ رات بھر اٹھ اٹھ کر کبھی تھوک کا معائنہ کرتی، کبھی ٹمپریچر دیکھتی، کبھی بلغم کی کمی و بیشی اور نوعیت پر غور کرتے، رات تو کٹ ہی گئی، مگر ہفتوں ہم اس کشمکش میں مبتلا رہے، کہ ہمیں ضرور کچھ خطرناک بیماریاں لاحق ہو چکی ہیں، اور ہمارا یہ شک اس وقت تک دور نہ ہوا، جب تک ہم اپنی ایک سہیلی کے پاس نہ چلے گئے، اور مفت کے مشورے دینے والوں سے محفوظ ہوتے ہی نہ صرف ہم اچھے بھلے ہو گئے، بلکہ ہمیشہ کے لئے بیمار پڑنے سے توبہ کر لی۔

موسمی بخار سے تو ہم پیچھا چھڑا چکے ہیں، لیکن بے موسم کے مشیروں سے اٹھتے، بیٹھتے، سوتے، جاگتے، چلتے، پھرتے مفت کے مشوروں سے نجات پانا ابھی باقی ہے۔

ہمارا شہر ترقی کی راہ پر

جب میں چھوٹی تھی، ہمارا شہر ایک چھوٹا شہر تھا، آج میں بڑی ہو گئی ہوں میرا شہر بھی کافی بڑا ہو گیا ہے، لیکن اس وقت مجھے یہ بہت بڑا لگتا تھا، آج ایسا لگتا ہے گویا سمٹ کر بہت چھوٹا ہو گیا ہے۔ خدا جانے یہ میری نظروں کا قصور ہے یا دل کا، بہرحال اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، کہ اب ہمارا شہر بہت ترقی کر گیا ہے، جس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ میرا گھر، جو پہلے شہر کے کنارے ایک سنسان جگہ پہ واقع تھا، اب شہر کے بیچ میں آ گیا ہے' اور یہاں سے سکون اور خاموشی اس طرح غائب ہو گئی ہے، جیسے گدھے کے سر سے سینگ!

کچھ ایسا اتفاق رہا، کہ بچپن ہی سے میں کسی نہ کسی سلسلے میں زیادہ تر شہر سے باہر ہی رہی، لیکن جب بھی سال چھ ماہ پہ گھر آئی، شہر میں کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور پائی، میرے گھر کے سامنے میلوں دور تک کھیت ہی کھیت دکھائی دیتے تھے، ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے کھیت۔ لیکن اب بڑی تیزی سے کھیتوں کا دامن تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ ہر طرف مکان، ملیں، کارخانے اور مارکیٹ بنتے جا رہے ہیں، ہریالی اور شگفتگی کی جگہ دھول، دھواں، شور و غل اور ہنگاموں نے لے لی ہے۔ اونچی نیچی چھوٹی بڑی عمارتیں، دھرتی کے سینے پہ مونگ دلتی آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔

میرے محلے میں بھی بڑی ترقی ہوئی ہے، گھر گھر ریڈیو، ٹرانزسٹر، ریڈیوگرام اور ریکارڈ پلیئر آ گئے ہیں، جو دن بھر فل والیوم کے ساتھ کھلے رہتے ہیں۔ آپ کو اخبار پڑھنے یا اپنا ریڈیو کھولنے کی قطعی ضرورت نہیں پڑے گی، کیونکہ دن بھر کی تمام خبریں

کچھ نمک مرچ کے ساتھ صبح و شام اہلِ محلہ کے بہ آوازِ بلند تبصروں اور ریمارکس کے ذریعہ بہ آسانی مل جاتی ہیں، ان کے علاوہ چیختے چلاتے ریڈیو نہ صرف خبریں سُناتے ہیں بلکہ کومنٹری، گانے، بھجن، قوالی، ٹھمری، دادرا، غزلیں اور ڈرامے وغیرہ سُنا کر کانوں کے پردے پھاڑنے کے لئے ہمہ وقت حاضر رہتے ہیں۔

یہ محلے والے سائنس کی دوسری نعمتوں سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھانے سے کبھی نہیں چوکتے۔ سائنس کا ایک ادنیٰ کرشمہ لاؤڈ اسپیکر ہی کو لیجئے۔ خوشی کی تقریب ہو' یا مذہبی فریضہ، لاؤڈ اسپیکر کے بغیر اسے منانا ادھورا سمجھا جاتا ہے۔ اپنے گھر ہونے والی خوشی کا اعلان جب تک دو تین ہفتہ تک دن رات لاؤڈ اسپیکر پر گانوں کے ریکارڈ بجا بجا کر نہ کرلیں، اُن کی خوشی پوری نہیں ہوتی۔ اب اس سے کوئی بحث نہیں کہ خوشی کے موقع پر المیہ گانے سُنا سُنا کر رُلایا بھی جائے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہفتوں کی شب بیداری یوں بھی رُلانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اُس طالب علم کو آپ ہرگز بُرا نہ کہئے گا جو صبح ہسٹری کے پرچے میں اشوک اور اکبر کی تاریخ لکھنے کی بجائے لتا اور کشور کی ہسٹری لکھ آیا۔ رات بھر جاگ کر اور گانے سن سن کر وہ غریب اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اُس مریض کے لئے دل ہرگز نہ دُکھایئے گا، جو ڈبل ڈوز خواب آور دوا کھانے کے باوجود رات بھر تڑپ تڑپ کر کروٹیں بدلتا رہا۔ اپنا مرض بڑھاتا اور زندگی کم کرتا رہا۔

میرا شہر آبادی کے اعتبار سے بھی بہت آگے ہے، خصوصاً میرا محلہ۔ ہر طرف بچے ہی بچے دکھائی دیتے ہیں۔ گھروں کے اندر اور باہر، سڑک پر، گلی میں، دیواروں پر' چھجوں پر، پیڑوں پر۔ ہاں، اگر نہیں ملیں گے تو اسکولوں میں۔ عورتیں سکون سے کام کرنے کے لئے، پھر آرام کرنے کے لئے، ان کی تعلیم و تربیت سے بے نیاز، بچوں کو گھر سے باہر نکال کر، اندر تالہ ڈال دیتی ہیں، حالاں کہ یہ ان کا خیالِ خام ہے۔ جس گھر میں ایک درجن سے زیادہ عورتیں ماں بیٹی' ساس، بہو اور نند کی شکل میں موجود ہوں'

وہاں سکون کہاں، مرد اپنے ملاقاتیوں سے اطمینان سے باتیں کرنے کے لئے گھر کی بجائے گلی کے نکڑ، چوراہے یا سڑک کے فٹ پاتھ کا انتخاب کرتے ہیں۔

اب سے کچھ سال پہلے سردیوں میں جب میں اپنے گھر آئی تو شہر میں بڑی ہلچل تھی، بڑی گہما گہمی تھی، بڑا جوش و خروش تھا۔ پتہ چلا، شہر اب ضلع بننے جا رہا ہے، اس کا جشن منایا جا رہا ہے، کئی راتیں ناچ گانوں کی مجلسیں ہوتی رہیں، دعوت پارٹیاں ہوتی رہیں، سب کے ساتھ ہم بھی خوش تھے، اپنا شہر ترقی کے راستے پر آگے بڑھ رہا تھا۔

دو تین ماہ بعد آئی، تو اسٹیشن ہی پر لگا کہ واقعی شہر بہت آگے بڑھ چکا ہے اسٹیشن کی عمارت تو ویسی ہی تھی، لیکن سب سے پہلے قلی نے، پھر رکشا والے نے، دُگنے پیسے مانگے "کیوں بھئی! —— دو ہی مہینے میں اتنی اُجرت بڑھ گئی؟"

"پہلے کا بات اور تھا صاحب!" رکشا والا غرور سے بولا "اب یہ ٹاؤن ڈسٹک بن گیا ہے، بڑا بڑا صاحب لوگ آتا ہے یہاں!"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بڑی حقارت سے کہہ رہا ہو۔

"تمھاری کیا حقیقت ہے اس بڑے شہر میں"

گھر آئی، دو چار دنوں بعد اندازہ ہوا گھر والے کچھ پریشان ہیں۔ پتہ چلا گھر کا خرچ بہت بڑھ گیا ہے، جبکہ آمدنی وہی ہے۔ گھر میں چاروں طرف غور سے دیکھا، کوئی آئیٹم بڑھا ہوا نظر نہ آیا، لیکن گھر والوں نے اور ان سے زیادہ نوکر نے بتایا۔ ہر چیز کی قیمت بڑھ گئی ہے، ہر کام کی اُجرت بڑھ گئی ہے، خانہ داری کا خرچ بڑھ گیا ہے، مزدور مزدوری زیادہ مانگتے ہیں، درزی سلائی زیادہ مانگتے ہیں، ہر طرح کی فیس بڑھ گئی ہے، پوچھو بھلا کیوں؟ اس لئے کہ شہر ضلع ہو گیا ہے، شہر کا اسٹیٹس بڑھ گیا ہے، شہر والوں کا سٹینڈرڈ بڑھ گیا ہے، بڑے بڑے افسر آگئے ہیں، ہر طرف کاریں، بنگلے، بلڈنگیں دکھائی دیتی ہیں۔ شہر کے دائیں بائیں، وائرلیس کے مینار سنتری کا کام دے

رہے ہیں۔ میں ہنسی اور کہا۔" واقعی یہ تمام نشانیاں ترقی کی ہیں، کیا غریبوں اور اوسط درجے والوں کو اتنی قربانی بھی نہ دینا پڑے گی۔"

چھوٹے بھائی بہنوں نے الگ شکایت کی، ابّا اور امّاں دن بدن پُرانے خیال کے ہوتے جا رہے ہیں، لوگوں کے یہاں کتنی ترقی ہو رہی ہے، کتنے گھروں میں گیس کا چولھا، فرج، کولر، کوکنگ، رینج وغیرہ آگئے، مگر یہ لوگ منگانے کا نام نہیں لیتے، آخر ہمیں پڑھانے لکھانے کا فائدہ کیا۔ ملنے والوں اور بہت سے عزیزوں کے یہاں جا کر محسوس ہوا، کہ واقعی بڑی ترقی ہوئی ہے یہاں۔ بھائی بہن ٹھیک ہی کہہ رہے تھے، پر انھیں یہ کیسے سمجھایا جائے کہ اوّل تو یہ چیزیں پیسوں سے آتی ہیں، دوسرے یہاں ان چیزوں کی حیثیت شو کیس میں رکھی ہوئی خوبصورت چیزوں سے زیادہ نہیں۔ ان سے گھر تو سجا سکتے ہیں، لیکن استعمال میں نہیں لا سکتے۔ آخر ہمارے شہر کی بجلی بھی کوئی چیز ہے، ہر محبوب چیز نخریلی ہوتی ہے۔ بجلی کی ادائیں بھی ان محبوباؤں سے کم نہیں، جھلک دکھائی اور غائب، رہی بھی تو آدھے پردے میں، آدھی باہر، یعنی کہ ——— ع: صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

اپنا شہر تعلیمی میدان میں بھی بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ یہاں پہ ہر پارٹی، ہر سوسائٹی، ہر ذات، ہر مذہب و فرقے کے تعلیمی ادارے الگ الگ ہیں، ان اداروں کی تعلیمات نہیں، بلکہ سائن بورڈ بتا دیں گے، کہ یہ کس فرقے کا ادارہ ہے۔ بہت سے ملکوں میں بچّوں کی پڑھائی مفت ہوتی ہے، ٹیچروں کو اچھّی تنخواہ دی جاتی ہے اور ان کی عزّت سماج اور بچّوں میں یکساں ہوتی ہے۔ حساب کتاب تو یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہے لیکن ذرا سا اُلٹ دیا گیا ہے، یعنی ہمارے یہاں بہت سے اسکولوں میں ٹیچر مفت پڑھاتے ہیں اور طلباء سے فیس زیادہ لی جاتی ہے۔ طلباء نے استادوں کی عزّت اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے اور اپنی عزت ان سے کراتے ہیں۔

ہمارے شہر کے اسکول اور کالجوں میں تقریباً سارے سال اسٹرائک رہتی ہے، کبھی استاد تنخواہ بڑھوانے کے لئے اسٹرائک کرتے ہیں، کبھی بنا پڑھائے تنخواہ پانے کے لئے۔ کچھ دنوں کے بعد جب ادارے کھلتے ہیں تو پھر جلد ہی بند کر دیئے جاتے ہیں، کیونکہ اس بار طلباء فیس معاف کرانے کے لئے، پھر کورس ختم کرانے کے لئے، پھر بغیر امتحان دیئے پرموشن پانے کے لئے، اپنے اپنے اسکول اور کالج بند کرا دیتے ہیں' اس طرح اسٹرائک کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، لیکن اس سے اداروں کا کام بند نہیں ہوتا کیوں کہ ہمارے یہاں اسکول کالج سے زیادہ آفس کھلے رہتے ہیں، داخلے بھی ہوتے ہیں' اور امتحان بھی ہوتے ہیں اور نتیجے بھی نکلتے ہیں۔ بس ذرا تاریخوں اور سنوں میں اُلٹ پھیر ہو جاتا ہے۔ ترقی سے پہلے عموماً اپریل مئی تک امتحان ختم ہو جاتے تھے لیکن اب سارے سال امتحان کا چکّر چلتا رہتا ہے۔ دسمبر تک یہ مرحلہ بھی ختم ہو جاتا ہے، نتائج بھی ایک دو سال کے اندر نکل آتے ہیں۔ ٹیچروں کی تنخواہیں وقتاً فوقتاً ملتی رہتی ہیں، غرضیکہ تعلیمی میدان میں اس شہر نے بڑی ترقی کی ہے۔

اس ترقی پذیر شہر میں آپ کو قدم قدم پر وکیل اور ڈاکٹر ملیں گے۔ بے شمار نرسریز اور کلینک ملیں گے۔ اسی تناسب سے قبرستان بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔

ابھی جب میں اپنے شہر کی ترقی کی داستان قلم بند کر رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا گویا کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں، جو مجھ سے فریاد کر رہی ہیں، کہ ہمیں کس بناء پر نظر انداز کیا گیا، مثلاً کوڑے کچرے کے ڈھیر، سڑک کے گڑھے اور نالیاں، مچھّروں، مکھیوں اور کھٹملوں کے حیرت انگیز طور پر بڑھتے ہوئے خاندان۔

سب سے پہلے تو شہر کی ترقی یافتہ گندی نالیوں ہی کو دیکھیئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان نالیوں اور نالوں نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے۔ پہلے تو اپنی اپنی جگہوں پر ہی بڑھتے اور پھلتے پھولتے رہے، جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی اس حرکت پر کوئی روک

ٹوک نہیں، بلکہ حوصلہ افزائی ہو رہی ہے، تو انھوں نے ہاتھ پیر پھیلائے، اور جہاں جی چاہا، اپنا گھر بنا لیا، نہ صرف سڑک کے کنارے بلکہ اس کے بیچ میں بھی۔ بس یوں سمجھ لیجئے، کہ انھوں نے خود ساختہ نالیوں کا ایک جال سا بچھا لیا، آج ہر گلی، سڑک اور شاہ راہ پر ان کا راج ہے۔

ان کے بعد نمبر آتا ہے کوڑے کرکٹ اور غلاظت کا۔ ہمارے بچپن میں سڑک کے بیچ میں کوڑا جمع کرنے کا رواج نہیں تھا، گھروں کے آگے بھی لوگ کوڑا نہیں جمع کرتے تھے، بلکہ اپنی حیثیت کے مطابق پھول پتّے لگاتے تھے، لیکن اب کوڑے کے انبار گھروں کے سامنے اور سڑکوں کے بیچ میں لگانے کا فیشن عام ہو گیا ہے۔ پہلے لوگ اتنے اناڑی تھے، کہ ذرا سی ٹھوکر کھا کر گر پڑتے تھے۔ اینٹ یا پتھر کا ٹکڑا نیچے آجانے سے گاڑیاں اُلٹ جاتی تھیں۔ لوگ راستے کا پتھّر، اینٹ یا کانٹا اٹھا کر پھینک دینا ثواب یا صدقہ سمجھتے تھے، لیکن اب لوگ بہت ہوشیار ہو گئے ہیں۔ دوسروں کے پھٹے میں پیر ڈالنا نہیں چاہتے۔ بڑی مہارت کے ساتھ گڑھوں، کوڑے کے ڈھیروں اور نالیوں کے درمیان گھری ہوئی سڑک کو پار کر لیتے ہیں۔

ان کی ترقّی دیکھ کر بھلا سڑکوں کے گڑھے کہاں پیچھے رہنے والے تھے، انھوں نے بھی پر پُرزے نکالے اور سڑکوں پہ ہر طرف پھیل گئے۔ پرانے گڑھوں کا خاندان بڑھنے لگا، بہت سے چھوٹے چھوٹے گڑھوں نے جنم لیا، جو کل بڑے ہو کر چھوٹے گڑھے پیدا کریں گے۔ اگر چلتے چلتے آپ کا پیر کسی کیچڑ بھرے گڑھے میں جا پڑے، اور آپ بھرے بازار میں چاروں شانے چت ہو جائیں، یا ہاتھ پیر کی ہڈی تُڑوا بیٹھیں، یا آرام دہ گدی دار گاڑیاں کھٹارا کا مزہ دینے لگیں، تو آپ ان گڑھوں کو قصور وار نہ ٹھہرائیے، آخر ان کو بھی جینے اور آگے بڑھنے کا حق ہے۔

پھر یہ بھی تو دیکھیے، کہ ان نالیوں، کوڑوں اور گڑھوں سے کتنے بڑے بڑے خاندان پل اور پنپ رہے ہیں۔ اجی! یہی مکھی، مچھّر، کھٹمل، کیڑے مکوڑوں اور جراثیموں کے خاندان، ان کی کُنبہ پروری، اُن کی ترقی ہی کی وجہ سے تو ہو رہی ہے، نسل کُشی کا گناہ کون اپنے سر لے۔ ترقی کا زمانہ ہے، انھیں بھی ترقی کرنے دیجیے، کیوں کہ ان کی ترقی شہر ہی کی ترقی کا ایک حصّہ ہے اور ہمارا شہر ترقی کر رہا ہے۔

★★

لوگ کہتے ہیں

لوگ کہتے ہیں ہم لاپرواہ ہیں، لیکن آج تک ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی، کہ لوگ ایسا کیوں کہتے ہیں، ہاں یہ ہماری بدقسمتی تو ضرور ہے کہ ہم جب کوئی کام بڑی احتیاط اور سوچ بچار کے بعد کرتے ہیں، اس میں کوئی نہ کوئی خرابی ضرور پیدا ہو جاتی ہے، یہ بھی لوگ ہی کہتے ہیں، ہمیں خرابی تو خرابی، کوئی خرابہ تک نظر نہ آیا۔

ابھی کچھ ہی دنوں کی بات ہے، ہمارے بھائی صاحب کی شادی تھی، کام کی کثرت اور والنیٹروں کی کمی کی وجہ سے ہمارے اس وصف کو جاننے کے باوجود کچھ دعوت نامے ہمیں بھی دیئے گئے۔ معاملہ بڑا سنگین تھا، ہمارے احباب کی کثرت اور کارڈ معدودے چند۔ بالائے ستم یہ کہ دُلہن والوں کی طرف سے شدید اصرار، کہ بارات اگر صفر نہ رہے تو بھی صفر کے آگے کے ہندسے سے زیادہ ہندسہ نہ بڑھے اور دولھا میاں تو اس ایک کے بھی قائل نہ تھے، کیوں کہ دوسروں کی جیب شکنی سے زیادہ ان کو اپنی جیب شکنی کا خیال تھا۔ ایسی صورتِ حال میں جو ہم دعوت نامے لے کر چلے ہیں، تو کسی کا گھر ایسا نہیں ملا، کہ اکیلا مدعو مل گیا ہو۔ کہیں ان کی نصف بہتر بیٹھی مل گئیں، کہیں کسی کے بچّے، کہیں کسی کے عزیز و اقارب، کچھ راستہ چلتے دوستوں نے کارڈ کی خوشبو سونگھ لی۔ گلی محلّہ کے لوگ تو الگ رہے اپنی مروّت کا یہ عالم کہ ان " نامدعوئین " کو کیسے نظرانداز کیا جائے۔ ناچار کسی دعوت نامہ میں مع اہلیہ کا اضافہ کیا کسی میں خاندان، کسی میں مع اہلیان خاندان

بڑھانا پڑا، تو کسی میں مع اہلِ محلّہ۔ جو لوگ راہ چلتے مل گئے تھے، انھیں زبانی دعوت دے بیٹھے۔ اب آپ ہی انصاف کیجیے، اس میں میری کیا غلطی تھی۔ یہ کہاں کا انصاف تھا کہ دعوت نامہ قبول فرما رہی ہیں بیگم صاحبہ اور ہم انھیں کا بائیکاٹ کیے دے رہے ہیں۔ مدعو کے عزیز و اقارب ہمارے خاندان کے ایک ایک فرد کا حال چال اور خیریت اتنی محبت اور اپنائیت سے پوچھ رہے ہیں، اور ہم انھیں کو چھلنٹے دے رہے ہیں۔

گلی محلّہ والے ہمارے ہر ہنگامے میں ساتھ دینے کو تیار، ہر بگڑی آڑی میں کھیون ہار، اور ہم ہنگامۂ شادی سے انھیں بے کنارہ کیے دے رہے ہیں لیکن اس اخلاق، محبت اور مساوات کا ایسا بدلہ ملا، کہ ہم اپنے بزرگوں، بزرگانِ دین اور شیخ سعدی کے تمام اخلاقی درس حتیٰ کہ حکیم لقمان کے صد پند بھی بھول جانے کی قسم کھا بیٹھے۔

لوگ جو ہمیں وعدہ خلاف کہا کرتے ہیں، دراصل اس کی بھی کوئی اصل نہیں اور نہ ہی ہمیں اپنی کوئی غلطی نظر آتی ہے، اکثر ایسا ہوا ہے کہ ہم نے کھانے پر کسی معزز مہمان کو بلایا اور خود گھر سے غائب۔ دراصل اس میں بھی ہماری وہی محبت اور مروّت کارفرما ہوتی ہے۔ گھر سے تو چلے اسی معزز مہمان کے اعزاز میں کچھ اور لوگوں کو بلانے، اور اور بلا یا بھی، لیکن اس کو کیا کہیے، کہ جس کے گھر بھی گئے، اس نے یا تو چائے پان میں دیر لگا دی، یا مجھے باتوں میں لگا دیا، اور آخری مہمان کو لے کر جب ہم گھر پہنچے، تو پتہ چلا کہ سارے مہمان بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد بغیر کھائے پیے ہماری جان کو کوستے اور پھر ہم سے نہ ملنے کا عہد کرتے ہوئے سدھار چکے ہیں، کیوں کہ اتفاق سے ہم گھر پر اس گرینڈ دعوت کا ذکر کرنا بھول گئے تھے۔

ہمارے وہ دوست بھی ہم سے بے حد خفا ہیں، جن کی بے حد محبت اور اصرار پر ہم ان کے یہاں جانے کو تیار رہتے، اور ہمارے بار بار یہ کہنے پر کہ "جانور اور چھوٹا کرو"

وہ مُرغ سے تیتر پر اُتر آئے تھے، ان کی وہ شاندار دعوت ہم کیش کرنے ان کے یہاں کیوں نہ پہنچ سکے اس کی وجہ لوگوں کو کیا بتائی جائے کہ نکلے تو ہم ان کے گھر ہی جانے کے لئے تھے، لیکن دوسرے دوستوں نے مِل جُل کر ایسا گھیراؤ کیا، کہ ان کے نرغے سے نہ نکل سکے، ان کے یہاں نہ جانے میں بھی ہماری ایک حکمت تھی، کہ کہیں یہ پوری بٹالین نہ ہمارے ساتھ ان کے یہاں پہنچ جائے، کیوں کہ ہمیں اپنے بھائی کی وہ بارات پلیٹ فارم پر سینکڑوں کی تعداد میں ہنستے گاتے، چیخنے چلاتے باراتی اور خود ہمارے بھائی صاحب کا انجن بن کر شنٹنگ کرنا اچھی طرح یاد ہے۔

ہماری ایک چچی صاحبہ ہیں، ان کا قول ہے کہ سچائی اور صاف گوئی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دوسرا وصف نہیں، ان ہی صداقت چچی کے یہاں ایک دن ہم جا پہنچے، ان کا گھر خلافِ معمول بڑا صاف ستھرا اور سجا بنا دکھائی دیا۔ چچی کا سامنا ہوتے ہی میرے مُنہ سے ان ہی کے الفاظ پھسل پڑے۔

" اہا! آپ کا پھٹکار زدہ گھر تو آج ماشاء اللہ بڑا لائٹ مار رہا ہے۔ لگتا ہے آپ کی جھاڑو پھری بہو نے سجایا ہے " ابھی میری اس تعریف کا کوئی جواب ملا بھی نہیں تھا کہ میری نظر آنگن میں گھومتی سجی بنی ایک چھیل چھبیلی نار پر پڑ گئی۔

میں نے پوچھا " یہ کون ہیں؟"

" ارے تم نے پہچانا نہیں، یہ منّے میاں کی دُلہن ہیں "

ہم حیرت سے بول پڑے۔

" لیجیے بھلا ہم پہچانتے کیسے، ہمارے تصوّر میں تو ایک کالی کوئلہ سی بھابی تھی سچ بتایئے چچی، کیا یہ آپ کی وہی بہو ہے جس کے بارے میں آپ کہا کرتی ہیں ـــ صورت پھٹ کبلوں جیسی اور مزاج پریوں والے "

یہ سن کر چچی کا کھٹا کھٹ چلتا ہوا سروتا بجائے ڈلی کے ان کی انگلی پر چل گیا۔

وہ چھیل چھبیلی نار چلتے چلتے یک لخت رُک گئی۔ چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ نکا ہیں بجلیاں برسانے لگیں۔ بیچی اس قدر سٹپٹائیں، کہ مجھے بیٹھانا بھول گئیں۔ وہ نار ایسی تاؤ میں آئی، کہ بجائے میرے، چچی کی زبانی خاطر تواضع میں لگ گئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ صاف گو لوگوں اور تسبیح صداقت کے پڑھنے والوں کے آگے کبھی سچ نہیں بولنا چاہیئے۔ کیوں کہ اسی دن سے بہو کا چچی سے، اور بیچی کا مجھ سے ان بولا ہے اور خلق کے سامنے اب ہم مُنہ پھٹ بھی ہیں۔

اب چلتے چلتے ایک پتے کی بات اور ہم آپ کو بتا دیں، کہ چاہے دُنیا کے کسی موضوع پر آپ سچ بولیں تو بولیں لیکن کبھی بھولے سے بھی اپنی یا دوسرں کی عمر کے بارے میں سچّائی سے کام نہ لیں، اگر آپ ایسا کرتے ہیں، تو یا تو کسی کی لگی لگائی شادی چھڑواتے ہیں یا نوکری۔ اس لئے کہ ہم ظاہری عمر سے زیادہ حقیقی عمر کو مانتے ہیں۔ اب آپ کہیں گے، کہ اپنی عمر صحیح بتانے میں کیا خطرہ ہے، تو سُنیئے، اس میں آپ کو یا آپ کے چھوٹوں کو تو کوئی خطرہ نہیں ہے، لیکن آپ کے بزرگوں کو ضرور ہے۔ اگر آپ نے سچ بتا دیا، تو یقین جانیئے، کہ آپ کا حشر بھی وہی ہو گا، جو ہمارا ہوا تھا۔

ہوا یوں، کہ ایک بار ایک ایسی محفل میں جہاں زیادہ تر ہمارے "بڑے" اور "بزرگ" موجود تھے، جن میں زیادہ تر اپنے سفید بالوں کو اسلامی اور غیر اسلامی خضاب سے لال اور کالا بنائے ہوئے تھے۔ کچھ عمروں کا ذکر چھڑ گیا۔ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ ہم نے اپنی صحیح عمر جوڑ جاڑ کر ساٹھ ۶۰ نکال لی۔ اب کچھ نہ پوچھیئے، کہ ان نابالغ بوڑھے بوڑھیوں پر کیا گذری۔ ایک دم سے ہم پر پنجے جھاڑ کر پڑ گئے۔

"سچ کی بھی انتہا ہوتی ہے؟"

"تم نے بھی سچ بولنے کی حد کر دی!"

"ایسا بھی کیا سچ، جو دوسروں کو بے عزت کر دے"

"ارے بے شرم، تجھے اپنا نہیں تو دوسروں کا خیال تو ہوتا" وغیرہ وغیرہ۔

چند بزرگ تو ایسا غیظ میں آئے، کہ ان کی نقلی بتیسیاں نکل پڑیں،

اور ان سب کے جواب میں ہم صرف یہی سوچتے رہے، کہ اس میں ہماری کیا غلطی

ہے، ہم نے تو سچ کہا تھا، اور سچ کے سوا کچھ نہ کہا تھا۔

★★

وقت کی مار

بچپن سے سنتے چلے آرہے ہیں، کہ وقت بہت بری شے ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو یہ محاورے کیسے بنتے:

"وقت آپڑا ہے"

"وقت وقت کی بات ہے"

"خدا کسی پر وقت نہ ڈالے"

وقت کی اہمیت جانے بغیر ان محاوروں کو موزوں و ناموزوں لاتعداد بار استعمال کرتی چلی آئی ہوں، خود تو کبھی وقت کی مار میں مبتلا ہونے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، لیکن اس بات کی تو اب میں بھی قائل ہوتی جا رہی ہوں کہ

"وقت نے کس کا ساتھ دیا ہے"

اچھی بھلی آرام کی زندگی گذر رہی تھی، لیکن میری شامت جو آئی، تو میں بھی وقت کی مار میں مبتلا ہو گئی، اب آپ ہی انصاف کیجیے، دن میں کم از کم سو بار،

"انڈین ٹائم"

"ہندوستانی وقت کے مطابق"

"مشرق اور وقت کی پابندی" وغیرہ جیسے فقرے سن کر کوئی غیور مشرقی کب تک بیٹھا رہ سکتا ہے، یہ سب باتیں سن کر میرا خون کھول اٹھتا۔ جب میرا خون کھول کھول اور جل جل کر میرے رنگ کی طرح کالا ہو گیا، تو میں نے ایک فیصلہ کیا اور وہ تھا وقت کا پابند ہونا، دنیا کو نہیں تو کم سے کم اپنے وطن والوں کو تو دکھا ہی

دوں کہ وقت کا پابند ہونا کسے کہتے ہیں اور وقت کا پابند کیسے ہوا جاتا ہے۔

لیکن جب میں نے بہ بانگِ دہل اس بات کا اعلان کر دیا کہ آج سے ہم وقت کے پابند ہو گئے، اور ہمارا سارا کام گھڑی کی سوئی کے ساتھ ہو گا، تو میرا بُری طرح مذاق اڑایا گیا۔ بعضوں کو تو میری دماغی حالت میں بھی کچھ فتور سا نظر آنے لگا، کیوں کہ ہمارے یہاں کوئی صحیح الدماغ شخص ایسا سوچ بھی نہیں سکتا کس کی عقل ماری گئی ہے، جو اپنے آپ کو ساری دُنیا سے کٹ آف کر کے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنا لے، اس لئے مجھ کو اس پاگل پن سے دُور اور اپنے سے نزدیک رکھنے کے لئے طرح طرح سے میری حوصلہ شکنی کی گئی، بار بار تنبیہہ کی گئی۔

"اے بی، یہاں تو بڑے سے بڑا وقت کا پابند نہ ہو سکا، پھر تمھاری کیا حقیقت ہے، چہ پدّی چہ پدّی کا شوربہ۔"

مجھ پر بھی ضد سوار ہو گئی، اور ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"آخر وہ لوگ بھی تو ہیں، جو وہ کام کر گذرتے ہیں جو رُستم بھی نہ کر سکا۔ میں بھی دکھا کے رہوں گی، کہ رستم کسے کہتے ہیں۔"

اور اس دن سے میرا نام "رستم وقت" پڑ گیا۔

میرے ایک بزرگ نے جب میرا یہ عزم سُنا، تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے،

"ارادہ تو بہت نیک ہے، لیکن سوچ لو کہیں بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔ وقت کا پابند ہونا بڑی اچھی بات ہے، لیکن کبھی کبھی لیٹ ہو جانے سے بھی انسان بہت بڑی پریشانی سے نجات پا جاتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

وہ ایسے کہ ایک بار میں ایک میوزک کنسرٹ میں گیا۔ پروگرام شروع ہو چکا تھا، اور میں تقریباً ایک گھنٹہ لیٹ پہنچا تھا۔ میں پریشان تھا، اس لئے منیجر سے پوچھا۔

"اس سے پہلے کیا ہو رہا تھا"

جواب ملا "مس ماریا پبلک کے بے حد اصرار پر تیسری بار گا رہی ہیں"۔ میں بے ساختہ بول اٹھا "تب تو دیر سے پہنچنے کا مجھے کوئی غم نہیں"

اس لطیفہ کو سن کر مجھے ہنسی تو آئی لیکن میں نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ اور ڈٹی رہی اپنے ارادہ پر، اور سب کو دنداں شکن جواب یہی تھا، کہ بس اب تو ہم ہیں اور ہمارا ٹائم ٹیبل۔

کہتے ہیں CHARITY BEGISN FROM HOME (خیرات گھر سے شروع ہوتی ہے) اس لئے اصلاح اپنے آپ سے شروع ہونی چاہیئے، اپنے آپ پر نظر ڈالی تو خامیاں ہی خامیاں نظر آنے لگیں اسلئے سب سے پہلے آپ سدھار میں لگ گئی۔

اس کے لئے ضروری تھا کہ کچھ ضابطے اور اصول بنائے جاتے، اس لئے بڑی محنت اور لگن سے میں نے دن بھر کے کاموں کا ایک ٹائم ٹیبل تیار کیا، جس میں بستر سے اٹھنے سے بستر پر جانے تک کے تمام چھوٹے بڑے کاموں کے اوقات درج تھے، جنھیں مقررہ وقت پر کرنے کا عزم میں تہہ دل سے کئے ہوئے تھی۔ گھر والوں کو سختی سے منع کر دیا گیا کہ کوئی میرے کام میں مداخلت نہ کرے، اب بھلا کس کی مجال تھی کہ رستم وقت سے ٹکر لیتا۔

قصہ مختصر، پہلے دن میں نہایت جوش کے ساتھ اپنے مقررہ وقت پر گھڑی کے الارم کے ساتھ بیدار ہو گئی۔ اصول کی خاطر پیاری نیند کو خیرباد کہنا پڑا۔ شاید زندگی میں پہلی بار طلوع آفتاب کا منظر دیکھا، ورنہ آنکھیں آج تک تو غروب آفتاب ہی کو دیکھنے کی عادی تھیں، ناشتے کے وقت ٹائم ٹیبل کی دیواریں متزلزل نظر آئیں کیوں کہ ہماری بوا اس معاملہ میں خالص مشرقی ذہنیت رکھتی ہیں اور انڈین ٹائم کی زوردار حامی ہیں، اس لئے ناشتے کے وقت اماں کا سوکھا سا جواب ملا۔

"ناشتے کے لئے اتنی جلدی ہے اور اصول اتنا پیارا ہے تو رات کی باسی روٹی

اور سالن نعمت خانہ سے نکال کر کھا لو، ہم تو جب بوا آئیں گی اور گرم گرم ناشتہ تیار کریں گی، تب ہی کھائیں گے۔"

اب تو دو ہی صورتیں تھیں، یا تو ناشتہ گول کرو، یا باسی کھاؤ، لیکن بھوکا رہا کس سے جاتا۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ " بھوکے بھجن نہ ہوئے " ایک پیالی چائے بنانے میں ٹائم ٹیبل کا نقشہ ہی بدل گیا، دھوئیں والی چائے اور باسی سالن روٹی کھانے کے بعد مطالعہ کا وقت (ٹائم ٹیبل کے مطابق) آدھا بھی نہ رہا، لیکن یہ سوچ کر کہ دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا، مطالعہ میں غرق ہو گئی۔ اچانک ایک ٹھوکر سی لگی۔ سامنے منّی پڑوسن کی لڑکی کھڑی تھی۔ پڑوسن نے میرا نیا سویٹر کہیں پہن کر جانے کے لئے عاریتاً مانگا تھا چند لمحوں کے لئے میں چکرا گئی۔ ارے تو یہ! میرے ٹائم ٹیبل میں ایسے اہم کاموں کے لئے کوئی وقت نہ رکھا گیا تھا، حالاں کہ مانگ کر کام چلانا ہمارے معمولات میں داخل ہے۔ اس ضروری نکتہ کو مجھے ضرور سمجھنا چاہیئے تھا، لیکن اس بھول کی سدھار اس وقت ممکن نہ تھی، اس لئے میں نے اس سے کہا، یہ میرے پڑھنے کا وقت ہے، تم کسی فرصت کے وقت میں آکر لے لینا، وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی، اب میرا فرض تھا کہ میں اس چھوٹی بچّی کو وقت کی پابندی کا ایک سبق دوں، اس لئے میں نے اس کے سامنے ایک چھوٹی سی تقریر کر ڈالی جس میں میرے پورے پانچ منٹ دو سکنڈ صرف ہو گئے (بعد میں میری پڑوسن نے مجھ سے بات کرنا بند کر دی، کہ میں نے سویٹر نہیں دینے کے لئے بہانہ بازی کی اور لڑکی کو فضول باتوں میں الجھا دیا)

مطالعہ کے بعد جب میں کالج جانے کے لئے تیار ہونے لگی تو پہلی بار اس بات کا اندازہ ہوا کہ ایک عورت کو پورے طور سے تیار ہونے کے لئے کم از کم چار گھنٹے چاہئیں، جو وقت مکمل تیاری کا میرے ٹائم ٹیبل میں رکھا گیا تھا، اتنے میں تو

لپ اسٹک تک ٹھیک سے نہیں لگائی جا سکتی، اور صرف لپ اسٹک لگا کر تو کالج جایا نہیں جا سکتا، ظاہر ہے کہ کالج دیر سے پہنچی۔

کالج پہنچی تو ہماری پرنسپل صاحبہ Last in first out والی خالص افسرانہ ذہنیت رکھنے کے باوجود آچکی تھیں، اور نہ صرف آچکی تھیں، بلکہ حاضری کے رجسٹر میں میرے نام کے خانے میں اپنی فتح کا سُرخ جھنڈا بھی لہرا چکی تھیں۔

رات کو میں نے [illegible] اور پھر ٹائم ٹیبل میں ترمیم کی۔ کچھ وقت فضول کاموں اور گپ شپ کے لئے رکھا۔ صبح نئے ٹائم ٹیبل کے مطابق میرے تمام کام وقت سے پہلے ہو چکے تھے، اور جب میں کالج پہنچی تو وہاں چپراسی تک نہ آیا تھا۔

شام کو واپسی پر گھر میں ایک عجیب سی ہلچل دکھائی دی۔ معلوم ہوا کہ گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ان کے ناشتے اور چائے کے انتظام کے لئے باورچی خانہ جانے کا، پھر بیٹھ کر ان کا دل بہلانے کا حکم ملا، لیکن یہ وقت تو خود میرے تھوڑی دیر آرام کرنے، چائے پینے اور پھر ہوا خوری کا تھا، لہٰذا ٹکا سا جواب دے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شروع شروع میں مجھے ٹائم ٹیبل کے حساب سے چلنے میں کافی دقّت محسوس ہوئی، کیوں کہ آج تک ایک گھڑی تو کیا متعدّد گھڑیاں رکھنے کے باوجود گھڑی کو وقت کے مطابق چلنے کے لئے استعمال نہیں کیا تھا، آج تک سوچا ہی نہیں تھا کہ کتنا وقت صحیح معنوں میں کام میں صرف کرتی ہوں، اور کتنا فضول گپ شپ اور بے کار باتوں میں، لہٰذا میرے کام کے اوقات کبھی تو بڑھ جاتے اور کبھی گھٹ جاتے اس لئے مجھے تقریباً روز ہی ٹائم ٹیبل میں کچھ نہ کچھ ردّ و بدل کرنا پڑتا، کبھی کوئی آئیٹم بڑھانا پڑتا، تو کبھی کسی کام کے لئے کچھ وقت بڑھانا پڑتا۔

لیکن جناب اب تو یہ عالم ہے کہ میرے روز و شب گھڑی کے محور کے ساتھ

گھوم رہے ہیں، مجھے اچھی طرح معلوم ہوگیا ہے، کہ کس کام میں کتنا وقت لگتا ہے۔ مجھے
بات زبانی یاد ہوگئی ہے کہ منہ دھونے میں کتنے منٹ لگتے ہیں اور غسل کرنے میں کتنے
گھنٹے لگتے ہیں۔ مختلف میک اپوں یعنی کالج جانے کا میک اپ، سینما جانے کا میک اپ،
معمولی تقریبات میں جانے کا میک اپ، شادی بیاہ میں جانے کے میک اپ اور
کسی ادبی تقریب یا جلسے میں جانے کے میک اپ میں کتنا فرق ہے اور ہر ایک میک اپ
میں کتنا وقت لگتا ہے، ایک نوالہ کتنے منٹ میں چبایا جا سکتا ہے اور پانی کا ایک
گھونٹ یا چائے کی ایک کپ کتنے سکنڈ میں پی جا سکتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اب مشکل یہ آن پڑی ہے کہ جیسے جیسے ٹائم ٹیبل میرے قریب آرہا ہے،
میرے گھر والے، پاس پڑوس والے، کالج کے ساتھی ٹیچرز، میری سہیلیاں میرا ساتھ چھوڑتی
چلی جا رہی ہیں، کیونکہ بدقسمتی سے کسی کا نظام اوقات میرے ٹائم ٹیبل سے نہیں ملتا،
عام لوگوں کو تو چھوڑیئے، حکومت کے اہم شعبوں کو لیجیے، اوپر سے نیچے تک سب ہی
وقت کی طرف سے غفلت کے شکار ہیں، محکمہ ڈاک و تار کی غفلت کا تو کوئی جواب
نہیں، ہمارے بعض بعض خط ایسے بھی ہوتے ہیں، جو سال بھر کے بعد اپنی منزل مقصود
کو پہنچتے ہیں۔ اکثر ہمارے تار ہفتوں میں اپنا چند منٹوں کا سفر طے کرتے ہیں۔ ٹرینوں
کو دیکھیے، کبھی وقت پہ آنے کا نام نہیں لیتیں۔ میں تو ٹائم ٹیبل کا مطالعہ خاص کر کے
یہی دیکھنے کے لئے کرتی ہوں کہ ریل گاڑیاں چھپے ہوئے ٹائم ٹیبل سے کتنی لیٹ آتی ہیں۔
ایک بار کئی گھنٹے کے مسلسل انتظار کے بعد جب جھنجلا کر میں نے اسٹیشن ماسٹر سے پوچھا "جناب
یہ ریل گاڑیاں اتنی لیٹ کیوں آتی ہیں؟" تو جواب ملا "اگر ریلیں وقت پہ آنے لگیں تو وہ
ویٹنگ روم کس کام آئیں گے اور اس بورڈ کا کیا مصرف رہ جائے گا جس پہ ریلوں کے
لیٹ آنے کے ٹائم لکھے جاتے ہیں۔"

خیر مجھ میں ان صاحب کی طرح اتنی ہمت تو ہے نہیں جنھوں نے صرف وقت پر گاڑی

آنے کے انتظار میں تین دن گذار دیئے اور اصول کی خاطر اپنا سفر ملتوی کئے رہے اسلئے
اسٹیشن ماسٹر کا یہ مضحکہ خیز جواب سُننے کے بعد بھی بارہ گھنٹے لیٹ ٹرین پر سفر کرنا ہی پڑا۔
لیکن اب تو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ اس بھری پُری دنیا میں بجز ٹائم ٹیبل کے
کوئی میرا اپنا نہیں، سب خفا ہیں، دھیرے دھیرے میرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں، کیوں کہ جو وقت
میرے سونے کا ہے وہ وقت میری سہیلیوں کے آنے کا ہے، لہٰذا ان سے دور بھاگنا پڑتا
ہے، جو وقت میرے مطالعہ کا ہے، اس میں بچے کہانیاں سننا چاہتے ہیں اسلئے ان سے
بے مروّتی اختیار کرنا پڑتی ہے، جو وقت میری سیر و تفریح کا ہے اس میں اکثر گھر کے
چھوٹے موٹے کام نکل آتے ہیں، جس سے بچنے کے لئے دوسروں سے بے رُخی برتنی پڑتی ہے۔

ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ دعوتیں، پارٹیاں، سوشل تقریبات، ادبی و نیم ادبی
تقریبات، شادی بیاہ میں شرکت، سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے، کیونکہ اگر وقت پر دعوت
میں پہنچئے تو پتہ چلتا ہے کہ ابھی تک میز کرسیاں فرش فروش تک نہیں بچھے ہیں، تقریر
سننے جایئے تو معلوم ہوگا کہ مقرر تو درکنار، ابھی منتظمین کا کہیں دُور دُور پتہ نہیں،
مشاعرہ میں جایئے تو شاعر صاحبان وقت پر پہنچنا کسرِ شان سمجھتے ہوئے غائب ہیں لہٰذا
اپنے اصولوں کی خاطر ہر طرح کی دعوت، پارٹیوں اور تقریبات سے کنارہ کشی کرتی جارہی ہوں
اور عزیزوں اور دوستوں کی زبان میں "اَن سوشل" ہو کر رہ گئی ہوں۔

قصہ مختصر یہ کہ آج میں اپنے واحد ساتھی "گھڑی" کے ساتھ ایک تنہا، سونی
اور بے کیف زندگی گذار رہی ہوں۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا، اب آپ ہی بتایئے،
میں کیا کروں، اور آخر کب تک وقت کی مار میں مبتلا رہوں؟

ایسا بھی ہوتا ہے

ہمارے ایک واقف کار کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ایک صاحب ان کے یہاں جنازے میں شرکت کے لئے آئے۔ آتے ہی بڑے تپاک سے " السلام علیکم" کا نعرہ لگایا اور پھر ہنستے ہوئے بولے:

"کہو بھئی! سب خیریت تو ہے؟"

ایسا ہی نہیں، بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔

میرے ایک عزیز بتا رہے تھے، کہ انھیں ایک میت میں شرکت کرنا تھی۔ نماز جنازہ کے لئے سب لوگ کھڑے ہو چکے تھے اور صفیں درست ہو چکی تھیں کہ دور سے ایک صاحب بھاگتے ہوئے آتے دکھائی دیئے، سب رک گئے۔ اتفاق سے مرحوم کے بڑے بھائی کنارے ہی کھڑے تھے، وہ صاحب آتے ہی ان سے بغلگیر ہوئے اور چیخ کر بولے

"اماں یار کہاں رہتے ہو آج کل؟ کبھی ملاقات ہی نہیں ہوتی۔ وہ تو کہو کہ خوش قسمتی سے ایسا موقع ہاتھ آ گیا کہ تم سے ملاقات ہو گئی ورنہ میں کہاں اور تم کہاں"۔

میں نے ہی کیا، آپ نے بھی اکثر سنا ہوگا اور دیکھا بھی ہوگا، کہ کسی ایک گھر میں شادی کا ہنگامہ کھڑا نہیں ہوا، کہ بہت سے گھروں میں میاں بیوی، باپ بیٹی اور بھائی بہن کے درمیان جھگڑے کی بنیاد پڑ گئی۔ وجہ؟ — یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، وہی بنیادی اور بین الخواتینی وجہ۔ پہن کر جائیں کیا۔ ایک ہی جوڑے کو کہاں تک کوئی بار بار پہنے۔ ایسا بھی کیا کہ کسی کا خاص لباس ہی اس کا ٹریڈ مارک بن جائے اور دیکھنے والا پیچھے سے ہی دیکھ کر کہہ اٹھے کہ یہ تو مسز فلاں یا بنتِ فلاں ہیں۔

تو صاحب، یہ مسئلہ بے شمار گھروں کا ہے جہاں معمولی سے معمولی تقریب یا سینما تک جانا کپڑوں کی وجہ سے ایک مسئلہ بن جاتا ہے، لیکن یہ تو بتلائیے کیا آپ نے کبھی ایسا سنا ہے جو میں نے حال ہی میں ایک غمی کے موقع پر سُنا۔

ایک صاحبہ کو پریشانی یہ تھی، کہ ایسے موقعوں پر پہننے کے لئے ان کے پاس ڈھنگ کا کوئی جوڑا نہیں ہوتا، وہ اپنے قریب ہی بیٹھی ہوئی ایک صاحبہ سے فرما رہی تھیں۔

"کیا کروں بھئی، آنے میں دیر ہو گئی۔ پوری الماری چھان ماری۔ اللہ مارا کوئی ایسا جوڑا نہیں نکلا، جو ایسے موقع پر پہنا جا سکے، مجبوراً خالہ جان سے ایک سادی سوتی ساڑی مانگ کر لائی، اسی میں دیر ہو گئی۔"

دوسری صاحبہ بولیں۔

" ہاں بہن! یہ مسئلہ میرے ساتھ بھی ہے، در اصل کوئی معمولی اور اُداس رنگوں والی ساڑی میرے پاس بھی نہیں۔ بارہا سوچا کہ ایسے موقعوں کے لئے دو چار جوڑے رکھ چھوڑوں، لیکن کیا کروں، دکانوں پر جاتے ہی دماغ بدل جاتا ہے اور خرید لیتی ہوں وہی ریشمی چمکدار کپڑے۔ ہائے یہ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے۔"

اور یہی نہیں، ہماری ایک عزیزہ ہیں (از قسم جوڑو خانم) ان کا کہنا ہے کہ "بھئی میں خوشی کی تقریبات میں جانے سے زیادہ غمی کے موقعوں پر جانا پسند کرتی ہوں ـــــ"

آپ سمجھے کیوں؟ نہیں سمجھے نا؟ سمجھ بھی کیسے سکتے ہیں۔ ہم اور آپ تو کوئی جوڑو خانم کی طرح دُور کی کوڑی لا نہیں سکتے، ان کا کہنا ہے کہ " شادی بیاہ میں جاؤں تو ہزاروں جھمیلے ہیں، ایک تو اگر اپنے کپڑے جھم جھماتے ہوئے اور نئے نہ ہوں تو کم از کم بچّوں کے تو ہونے ہی چاہئیں، کچھ تحفے لے جاؤ، مٹھائی کے نام پر روپے دو۔

طرح طرح کے نیگوں پر پیسے نچھاور کرو۔ اب تو موئے ایسے فقنے پیدا ہو گئے ہیں۔ کہ سواری کا کرایہ تک نہیں دیتے، کرایہ بھی اپنے پاس ہی سے ادا کرو۔ لنڈ پاپڑ بیلنے کے بعد ایک وقت کے کھانے ہی کی تو بچت ہوتی ہے اور وہ بھی اب فیشن کے ماروں نے موئی چائے ہی پر نکاح کے دو بول پڑھوانے شروع کر دیئے ہیں۔

اس کی بجائے اگر غمی میں جاؤ تو بس فائدہ ہی فائدہ ہے۔ نہ کپڑے لتے کی فکر، نہ بچوں کی کنگھی چوٹی کی خبر، جو جس حال میں ہے، جا پہنچا، بلکہ حال کو اور بدحال بنالو تو زیادہ غم کا شریک سمجھا جاتا ہے۔ سب خوب ڈٹ کر پلاؤ قورمہ اڑاتے ہیں، کون دیکھتا ہے ایسے موقع پر کس نے کیا کھایا اور کتنا کھایا؟ بس دو چار آنسو بہا لینا کافی ہوتا ہے، اور اب تو غمی کے موقعے بھی کون سے شادی بیاہ کی تقریبات سے کم ہوتے ہیں، وہی چہل پہل، وہی ہنگامے، وہی رونقیں، وہی دھوم دھام۔"

ان کی اس لمبی تقریر کو سن کر میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور دل میں کہا "بجا فرمایا آپ نے، ایسا بھی ہوتا ہے!"

میں نے یہ واقعات جب اپنی سہیلی کو سنائے تو وہ بولیں۔

"بھئی یہ باتیں میرے نزدیک زیادہ شاکنگ اور حیران کن نہیں ہیں، اگر تم میرے ساتھ گذرا ہوا کل کا واقعہ سنو تو ان باتوں کو بھول جاؤ۔"

میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا۔

"کئی ماہ کی مسلسل کوشش اور کچھ چیزوں کی کٹوتی کے بعد کل جب میں اپنے بچوں کے لئے سنتھال ٹلکم پاؤڈر کا بڑا ڈبہ خرید کر لائی تو میرا چھوٹا لڑکا مچل گیا

"ممی، یہ پوڈر نہیں لگائیں گے، یہ تو کتوں کا پاؤڈر ہے۔"

میں اسے سمجھاتی رہی۔" نہیں بیٹے، یہ تو انسانوں کے لئے ہے۔ اس سے تمھیں گرمی اور گرمی دانوں سے نجات ملے گی۔"

لیکن وہ یہی کہتا رہا "میں نہیں لگاتا۔ یہ کتوں کا پاؤڈر ہے۔"

ہم میاں بیوی حیران، کہ یہ ماجرا کیا ہے، آخر بڑے لڑکے نے ہمارے قریب آکر بڑی رازداری سے کہا۔

"ممی، تم سمجھیں نہیں، یہ پپو ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ اپنی چاچی، جی کے یہاں جھبرے کتے پلے ہیں نا، اُنھیں یہی پاؤڈر لگایا جاتا ہے۔"

ہمارے ایک بزرگ جو وہیں بیٹھے ہماری بات سن رہے تھے، بولے۔

"بھئی ایسا کیوں نہ ہو، جب کتوں کے نام پر بچوں کے نام اور بچوں کے نام پر کتوں کے نام رکھے جائیں تو ایسا نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا۔"

ہمارے ایک انگریزی خواں، بلکہ یوں کہیے کہ انگریزی زبان کے پجاری عزیز کو ہمیشہ اردو زبان کے ناقص ہونے کی شکایت رہتی ہے اور اردو جو الٹی پلٹی سے پڑھی جاتی ہے، اس کے سخت شاکی رہتے ہیں، ایک دن غصے میں بھرے ہوئے آئے اور کہنے لگے،

"بھئی یہ تم لوگوں کی اردو آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی، آخر اس میں اعراب کیوں نہیں لگائے جاتے، زیر، زبر، پیش وغیرہ کی علامتیں کیوں نہیں استعمال ہوتیں۔ اسی کی وجہ سے آج میری سخت بے عزتی ہوگئی۔"

میں نے پوچھا "کیوں بھائی صاحب، کیا اردو بولنے کی وجہ سے آپ کی بے عزتی ہوگئی؟ تب تو بڑے افسوس کی بات ہے۔"

کہنے لگے "جلے پر نمک مت چھڑکو۔ آج ایک بھری محفل میں تھوک فروش کو تھوک فروش، اور کتا بچہ کو کُتا بچہ پڑھ گیا۔ اب بتاؤ قصور کس کا ہے میرا یا اردو رسم الخط کا۔"

اب آخر میں ایک چھوٹا سا واقعہ آپ کو سناتی ہوں کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوجایا کرتا ہے۔

ابھی پچھلے ہفتے کی بات ہے، میں ایک شادی میں گئی ہوئی تھی۔ بڑی دھوم دھام

تھی۔ بارات بڑے ٹھسّے سے آئی، نکاح کے وقت وکیل اور گواہ جب لڑکی سے ایجاب و قبول کے لئے اندر آئے تو میں بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھی، وکیل نے حسب دستور نکاح کے بول شروع کئے " فلاں ابن فلاں کے نکاح میں بعوض ․․․․ آپ کو دیا جاتا ہے، آپ کو یہ نکاح قبول ہے؟" ابھی وکیل نے نکاح کے یہ بول ختم ہی کئے تھے کہ دُلہن نے جلدی سے چلا کر کہا۔

"جی ہاں! قبول کیا میں نے۔"

آواز اتنی تیز تھی، کہ تقریباً باہر دولھا تک پہنچ گئی۔ اندر بڑی بوڑھیوں کے منہ کھُلے کے کھُلے رہ گئے، کہ ان کے زمانے میں لڑکیاں اس قدر شرم کرتی تھیں کہ جب اُن سے پوچھنے وکیل اور گواہ آتے تھے، تو ان کے پاس بیٹھی ہوئی کوئی بزرگ رشتہ دار خاتون ہُنکاری بھر دیتی تھیں اور نکاح 'قبول' ہو جاتا تھا۔

لڑکیوں نے دوپٹہ منہ میں ٹھونس کر ہنسنا شروع کر دیا۔ اندر سے باہر تک کھلبلی مچ گئی۔ اگرچہ یہ 'قبول' اتنا زور دار تھا، کہ تین بار کیا، دوبارہ بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود وکیل صاحب نے سات بار پوچھا۔

بعد میں پتہ چلا کہ وکیل صاحب دُلہن کے ماموں تھے اور ان کی خاص فضیلت یہ تھی کہ وہ کچھ اونچا سُنتے تھے۔

ہوم سویٹ ہوم

ہمارے گھر کے نام نہاد ڈرائنگ روم میں "ہوم سویٹ ہوم" کا خوبصورت فریم اس وقت سے آویزاں ہے، جبکہ ہم اس کے مفہوم کو سمجھنے سے بالکل کورے تھے لیکن یہ فریم اس وقت بھی مجھے اتنا ہی پیارا لگتا تھا جتنا کہ آج۔ اس وقت ہم فریم کی خوبصورتی پر جان دیتے تھے اور آج عبارت کی خوبصورتی پر۔

اب تو اس کا فریم اتنا پرانا ہو گیا ہے، جتنا کہ ہمارا گھر، اور اس کے شیشے پر اتنی گرد جم چکی ہے جتنی کہ ہمارے گھر کی ہر ایک شے پر۔ لیکن اگر سچ پوچھیے تو ہمارے گھر کی خوبصورتی اور شان کو بڑھانے میں اس فریم کا بڑا ہاتھ ہے، کیونکہ جس گھر میں گھر کے پیارے ہونے کا تحریری ثبوت موجود ہو، اس کی خوبصورتی اور جنت مکان ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔

ہم نے اس فریم کو اتنی بار دیکھا ہے، کہ اس کی عبارت شیشے سے اتر کر ہمارے دل پر نقش ہو چکی ہے اور اس کا مطلب نقش کالحجر سے بھی بڑھ کر ثابت ہو چکا ہے، لہٰذا ہمیں اس گھر کے علاوہ کہیں اور اچھا نہیں لگتا، کیونکہ دوسری جگہوں پر اور سب کچھ تو مل جاتا ہے، لیکن وہ فریم اور اس کی عبارت نہیں ملتی۔ بعض لوگ کتنے بے وقوف ہوتے ہیں، کہ گھر کو سجا بنا کر تو رکھتے ہیں لیکن اس کی گواہی دینے والی کوئی ایسی عبارت نہیں لگاتے، ایسے احمق بھی بہت پائے جاتے ہیں، جو گھر کو پیارا بنانے کے لئے ہمہ تن مصروف رہتے ہیں، لیکن کاہلی کا یہ عالم ہے کہ محض یہ فریم نہ لگا کر اس کی وقعت کم کر دیتے ہیں۔

اس طرح ہمیں اپنے پیارے "سائن بورڈ زدہ" گھر سے اتنا پیار ہو گیا ہے کہ اس کے علاوہ کہیں اور رہنے کے لئے سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس پیارے گھر میں ایک اکیلی میں ہی تو نہیں رہتی، اس میں تقریباً ۱/۲ ۴ درجن تو ہمارے چھوٹے بڑے بھائی بہن ہیں، بھائیوں کی بیویاں اور بہنوں کے شوہر نامدار، اور پھر خدا نظرِ بد سے بچائے، ہر ایک کے چیختے چلاتے روتے بلبلاتے پانچ پانچ چھ چھ بچے۔ اس پیارے گھر میں صرف انسانوں سے پیار نہیں کیا جاتا ہے، بلکہ جانور بھی اتنے ہی پیارے ہیں، اسی لئے گھر میں مرغیاں ہیں، بطخیں ہیں، بکریاں اور کتے بلیاں ہیں، کسی کو شوق ہوا تو اس نے کبوتر پال لئے، کسی نے مچھلیاں رکھ چھوڑی ہیں، کوئی طوطا پالنے کا شوقین ہے تو کوئی مینا۔ کمال تو یہ ہے کہ اس گھر میں جانور نہ صرف پالے جاتے ہیں، بلکہ ان سے مکمل طور پر مساوات اور بھائی چارگی برتی جاتی ہے۔

اگر بچوں کو صوفہ سیٹوں، مسہریوں اور کرسیوں پر کودنے پھاندنے اور چھلانگیں لگانے کی پوری آزادی ہے، تو ان جانوروں کو بھی ہر جگہ اٹھنے بیٹھنے کی پوری آزادی ہے، اگر منے میاں کی مرغی کو بڑے بھیا کے بستر کے گھونسلے میں بیٹھ کر انڈے دینے کی عادت ہے، تو وہ بخوشی وہاں بیٹھ کر نہ صرف انڈے دے سکتی ہے، بلکہ باقاعدہ "سے" کر بچے تک نکال سکتی ہے، بکریاں بڑے شوق سے صوفوں پر (جو اب صوفہ کم بیٹھے سے زیادہ صوفہ کم جھولا لگتے ہیں) بیٹھ کر جگالی کر سکتی ہیں، بطخیں کسی بھی آئے گئے پر گردنیں لمبی کر کے قیں قیں کرتی حملہ آور ہو سکتی ہیں، کتے کسی کو بھی کاٹ کھانے کو دوڑ سکتے ہیں اور طوطے مہمانوں کو میٹھی میٹھی گالیوں سے خوش آمدید کہہ سکتے ہیں۔

اب آپ انصاف کیجئے کہ جس گھر کی کل آبادی خیر سے اتنی ہو کہ جس میں محلے کی آدھی سے زیادہ آبادی سما جائے تو اس کے مکینوں کا جی، بھلا کہیں اور کیا لگے گا، یہ نہیں کہ اس گھر کے صرف کمرے، برآمدے اور آنگن وغیرہ ہی کسی نہ کسی جاندار کے دم سے

آباد ہیں، بلکہ اس گھر کا کونہ کونہ اور گوشہ گوشہ تک بھرا پڑا ہے، یعنی یہ کہ کسی کونے میں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر ہے، تو کسی گوشے میں آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام کا نقشہ دکھائی دے رہا ہے، کہیں ردّی کاغذ پڑے ہوئے ہیں تو کہیں اخبار کے صفحات پھڑپھڑاتے دکھائی دیتے ہیں، غرضیکہ کہنا یہ ہے کہ گھر کے کونے کونے سے پیار و محبت کی خوشبو آتی ہے، ایسی کہ اگر کہیں جاؤ تو "ہوم سِک" کا شکار ہو جاؤ۔

ہمارے گھر کا ایک گوشہ یا حصّہ وہ بھی ہے جہاں ہمارے بھائی صاحب مع بیوی بچّوں کے آباد ہیں۔ بھابی جہیز میں جہاں دُنیا بھر کی چیزیں لائیں وہاں "ہوم سویٹ ہوم" کا فریم لانا نہ بھولیں، چوں کہ ان کا فریم نیلا ہے، اس لئے اس کی قدریں بھی نئی ہیں۔ ہماری طرح انھیں بھی یہ گھر بڑا پیارا ہے، اتنا پیارا کہ اس کو چھوڑنے کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتیں، کیوں کہ پیارا گھر تو رحمتوں کا مسکن ہوتا ہے، وہ مسکن جہاں مولا کی رحمت بصورتِ تنزاع رات دن برستی رہتی ہے، یوں سمجھئے کہ ان کا گھر "خانہ جنگی" کا بہترین نمونہ ہے، صبح ہوئی نہیں کہ ادھر سے آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔

یہ وہ وقت ہوتا ہے جب بچّے اپنے اسکولوں کیلئے، مرد دفتروں کیلئے، نوجوان کالج و یونیورسیٹی کے لئے، اور گھر کی عورتیں اپنے دن بھر کی گپ شپ کے مسالوں کو اکٹھا کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہوا کرتی ہیں۔ عموماً یہ سلسلہ کھانا کھاتے وقت نمک کی کمی و بیشی کے سلسلے میں، یا روٹی کے جل جانے یا چاول کے کچّے یا گیلے رہ جانے کی تقریب ہیں، یا بات آگے بڑھی تو قمیض یا پینٹ کے بٹن غائب ہونے پر، یا جوتے کی پالش کی عدم موجودگی پر شروع ہوتا ہے، اور کسی برتن کے توڑنے، کپڑے کے پھاڑنے یا مُنّے میاں کی پٹائی کے ساتھ چیخ چیخ کر رونے کے تماشے پر ختم ہوتا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انھیں اپنے گھر سے پیار

ہے اور ہر وقت ان کی زبان پر اپنے گھر کے قصیدے رہتے ہیں۔ ان کو تو جھٹلایا جا سکتا ہے، لیکن اس فریم کو آپ کیسے جھوٹا بنا سکتے ہیں، جو بڑے اہتمام سے ان کے گھر پر ٹنگا ہے۔

تو یہ ہے میرا پیارا گھر، جس کے بغیر ہم ایک پل بھی کہیں نہیں رہ سکتے اور رہیں بھی تو کیسے، ہمارا پیارا گھر جو ٹھہرا۔

★★

میڈم

میڈم نے بھی کیا عجیب طبیعت پائی ہے۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ کبھی ہنسی کا پٹارا بنی خود قہقہہ لگا رہی ہیں اور دوسروں کو بھی قہقہہ لگانے کی دعوت عام دے رہی ہیں، کبھی سنجیدگی کے ایسے گہرے لبادے ہیں کہ مسکراہٹ تک منہ پر نہیں آتی۔ موڈ میں آئیں تو ایک دن میں گھر کے کئی پھیرے کر لئے، گھر گھیر ڈالا، کبھی مہینوں خبر نہ لی، کبھی تو آپ سے اپنی، اپنے بچوں کی، اپنے گھر کی تعریف میں قصیدے سننے کی خواہاں کبھی آپ نے ان کی کسی چیز کی تعریف کر دی تو جھٹ بول پڑیں،

"لاحول ولا قوۃ۔ یعنی کہ یہ آپ کو پسند ہے، مجھے تو بالکل پسند نہیں"۔ آپ یہ سن کر جل تو جائیں گی، لیکن یہ ہرگز نہ کہہ سکیں گی کہ "پسند تو مجھے بھی نہیں محض آپ کا دل رکھنے کو کہہ دیا تھا" کیونکہ میڈم کا مزاج بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔

میڈم کے یہاں کھانا کوئی نہیں کھاتا، پھر بھی کھانا پکتا ہے، اور وہ بھی ایسا ویسا نہیں، ایسا کہ شاید کسی کے یہاں نہ پکتا ہو، ان کے یہاں کھانا پکنا فیشن ہے، اور کھانا نہ کھانے کا پروپیگنڈا اس سے بھی بڑا فیشن، اور اسی فیشن کے تحت وہ کھانا کھاتیں نہیں، بلکہ چکھتی ہیں، اس کے باوجود اگر آپ ان کا تن و توش دیکھ لیں، تو منہ سے بے ساختہ نکل جائے ماشاءاللہ!

میڈم کو بحث کرنے پر عبور حاصل ہے، وہ ہر بحث میں جیت جاتی ہیں بحث کسی طرح کی ہو وہ اس میں حصّہ ضرور لیتی ہیں، زیر بحث موضوع کوئی بھی ہو، کشاکش زمانہ پہ ہو یا روز افزوں مہنگائی پر، تاریخ پہ ہو کہ حالاتِ حاضرہ پہ، تجریدی آرٹ پہ ہو

کہ علامتی افسانوں پر، سیاست پر ہو کہ ادب پر میڈم اس میں ضرور کود پڑیں گی۔ اس سے بھی کوئی غرض نہیں کہ وہ بحث لیٹن زبان کے پیچ و خم پر ہو رہی ہے، یا فرنچ ادب پر۔ میڈم بولیں گی ضرور۔ اور نہ صرف بولیں گی، بلکہ بڑے زور شور سے بحث کریں گی، اس زور سے کہ وہاں بیٹھے تمام عالم فاضل ہار جائیں گے، کیوں کہ وہ بے چارے اتنا تو ضرور جانتے ہیں کہ کہاں خاموش ہو جانا چاہیئے۔

میڈم کبھی کبھی بڑی عجیب و غریب مثالیں پیش کرتی ہیں۔ کہنے لگیں "خواتین میں حسِ مزاح کی کمی ہوتی ہے۔"

پوچھا "وہ کیسے؟"

انھوں نے ایک مثال دی۔

"فرض کرو، بازار میں ایک شخص جا رہا ہے اور وہ پھسل کر گر پڑا، وہاں موجود تمام لوگ ہنس دیں گے، لیکن اگر دس بھینسیں کہیں جا رہی ہوں اور ان میں سے ایک بھینس گر پڑے تو باقی نو بھینسیں اس پر ہرگز نہیں ہنسیں گی۔"

میں ان کی اس عجیب و غریب مثال پر زور سے ہنس پڑی اور بولی۔

"کیا پتہ بھینسیں بھی ہنستی ہوں، لیکن یہ تو بتاؤ، اس مثال سے عورتوں کی حسِ مزاح کی کمی کا پہلو کدھر سے نکلتا ہے۔"

"بالکل صاف نکلتا ہے۔" وہ حسبِ عادت اپنی بات پر زور دے کر بولیں "یہ تو تمھیں ماننا پڑے گا کہ ہنستا وہی ہے، جس میں کچھ عقل و شعور ہو، یا بات کو سمجھتا ہو یا سمجھنے کی کوشش کرتا ہو۔ انھیں کیسی ہی مزیدار بات سناؤ، لطیفہ یا مزاحیہ کلام سناؤ، کیا مجال کہ ٹوکے بغیر دھیان سے پوری بات سن لیں، یا اپنی ٹانگ نہ اڑائیں۔" میں دیر تک ان سے بحث کرتی رہی، کہ یہ کمی مرد اور عورت دونوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔ ایسے مردوں کی بھی کمی نہیں جو لطیفہ سن کر پوچھتے ہیں۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

یا "ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ناممکن!"

یا "کسی کی موت یا نقصان پر ہنسنا بُری بات ہے۔"

وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حسب عادت میڈم نے میری ایک نہ سُنی اور اپنی بات پر اڑی رہیں۔

میڈم پر کبھی کبھی سیاحت کا موڈ نہیں بلکہ بھوت سوار ہوتا ہے، اور جب ایسا ہوتا ہے تو وہ ہفتوں کیا مہینوں کے لئے غائب ہو جاتی ہیں پچھلے دنوں کافی دنوں بعد ان سے ملاقات ہوئی، معلوم ہوا جہان آباد گئی تھیں۔

پوچھا "کیسا شہر ہے؟"

بولیں "بہت اچھا۔ وہاں کی عورتیں بڑی شرم وحیا والی اور شریف ہیں۔"

پوچھا "کیا پردے کا رواج بہت ہے؟"

بولیں "نہیں! آنکھوں کا پردہ زیادہ ہے وہاں۔ مرد ہمیشہ نظریں جھکا کر باتیں کرتے ہیں، عورتیں ڈھکی ڈھکائی رہتی ہیں۔ مثلاً وہاں کی عورتیں پچاس سینٹی میٹر میں اپنا بلاؤز سیتی ہیں جس کی وجہ سے عریانیت بہت کم ہو گئی۔ گریبان بھی یہاں والیوں سے کم کھُلا ہوتا ہے اور بلاؤز کے گلے پر چاکِ گریباں کا دھوکا نہیں ہوتا۔ اکثر لڑکیاں گلے میں دوپٹہ ڈالے بھی نظر آتی ہیں۔

پوچھا "اور مردوں کی شرافت کا کیا حال ہے؟"

بولیں "مرد تو مرد، وہاں کے لڑکے نہایت شریف، لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے، ذرا ذرا سی بات پر ہائے اللہ کہہ کر سر جھکا لینے والے۔ پھر پہناوا تو اُن کا ایسا شریفانہ کہ بیان نہیں کر سکتی، کھُلی مہری کی غرارہ کو مات کر دینے والی پتلونیں، بند گلے اور پوری آستین کی جمپر نما قمیض، کہیں کہیں تو جھالر دار قمیض۔ لیس ٹکے ہوئے سوئٹر اور جیکیٹ کے نمونے بھی دکھائی دیئے۔ یہاں والوں کی طرح بالوں کی چوٹیاں نہیں گوندھتے اور نہ ہی بالوں

میں ڈالتے ہیں، سیدھے سادے پڑھے ہوتے ہیں۔ ہاں ذرا الاکٹ وغیرہ پہننے کے شوقین ہیں۔ غرضیکہ شرم وحیا اور طور طریقوں میں انھوں نے لڑکیوں کو کوسوں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔"

کہا "خیر، یہ تو ہوئی وہاں کے لوگوں کی شرافت کی باتیں، کچھ شہر کا بھی حال بتاؤ۔"

بولیں "شہر! اب شہر کی نہ پوچھو۔ جنت ہے جنت۔

— کم سے کم اپنے شہر کے مقابلے میں تو جنت ہی ہے۔ یہاں کھانے پینے کی چیزیں بہت اچھی اور خالص ملتی ہیں، ملاوٹ تو بس پچاس فیصد ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں اصلی گھی، دودھ، مکھن وغیرہ پچھتر فی صد ملاوٹ کے ساتھ مل جاتا ہے۔ بناسپتی، تیل، وغیرہ کبھی گوداموں میں پورے کے پورے بند نہیں ہوتے، کچھ نہ کچھ مارکیٹ میں ضرور رہتے ہیں ——— ہر چیز آسانی سے مل جاتی ہے ——— ہر آدمی کھاتا پیتا خوش حال ہے۔"

کہا "بھئی آخر وہاں کچھ غریب لوگ بھی تو ہوں گے۔"

جواب دیا "ہیں کیوں نہیں، لیکن جب وہ کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے تو غریب تو رہیں گے ہی، وہاں ایک طبقہ ایسا ہے، جو بس ہر وقت ایمان، مذہب، اخلاق وغیرہ کے گیت گاتا رہتا ہے، اب تم ہی بتاؤ، اِن سے کہیں پیٹ بھرتا ہے۔ آج کے زمانے میں ایسی 'آؤٹ آف ڈیٹ' باتیں۔"

پوچھا "شہر کی آب و ہوا کیسی ہے؟"

بولیں "ارے، اس کی نہ پوچھو۔ ایک دم فسٹ کلاس۔ وہاں کے مکان تو یہ بڑے بڑے اور کھلے۔ تمھیں یہ سُن کر تعجب ہوگا، کہ وہاں مکانوں میں لیٹرِن کے علاوہ غسل خانہ اور باورچی خانہ ہوتا ہے، اور وہ بھی الگ الگ —— اکثر گھروں میں میں نے برآمدے بھی دیکھے ہیں۔ کمرہ تو وہاں بھی ایک ہوتا ہے، لیکن برآمدہ، اور کسی کسی گھر میں آنگن جیسی عنقا چیز بھی نظر آگئی۔ بعض گھروں میں کھڑکیاں

اور روشندان تک نظر آئے، انھیں دن میں لائٹ بھی جلانا نہیں پڑتی۔

آب تو یہیں والا ہے، یعنی پائپ کا، جس میں کبھی نیلا، کبھی ہرا، کبھی پیلا پانی آتا ہے، بالکل یہیں جیسا، لیکن ہوا بہت اچھی ہوتی ہے گیس، گرد و غبار اور دھوئیں کی پرسنٹیج بہت کم۔

اب تم سے کیا بتاؤں کیسا شہر ہے۔ اگر اپنے شہر کے بلوے، فتنے فساد، اسٹرائکیں جلسے جلوس اور مہنگائی یاد نہ آتے، تو پھر کس کم بخت کا دل یہاں آنے کو چاہتا۔ ہائے رے اپنے وطن کی محبت، ہائے ری مجبوری۔

ایٹی کیٹ

طالب علمی کا سنہری دور انگریزوں کو برا بھلا کہتے گذار دیا، مگر انگریزوں کا بھی جواب نہیں، جانے کو تو چلے گئے، لیکن انگریزیت گلے منڈھ گئے۔ یوں کون کم تنگ کرتے تھے، خاص طور پر ان کی اوٹ پٹانگ والی انگریزی، اور پیچیدہ "اسپیلنگ" تو محض ہندوستانیوں کو تنگ کرنے کے لئے ہوا کرتی تھی اور وہ بھی صرف ہمیں انگلش میں فیل کرانے کے لئے۔ اس زمانہ میں انگلش کچھ ایسی جان کو چمٹی ہوئی تھی، کہ گھر سے لے کر اسکول، کالج اور یونیورسٹی تک ہر بزرگ اور استاد اس پر جان دیئے رہتا۔ ان کا سارا زور اسی زبان پر رہتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں نے اس پر کبھی زور نہیں دیا۔

ہجے کی پیچیدگی اور ٹیڑھا پن بھی کہیں سمجھ میں آنے والی بات ہے، اور سچ پوچھیے تو اس کی ہجے اور تلفظ کا تضاد آج تک اپنی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس مصلحت کی بنا پر ہے۔ آپ ہی انصاف سے کہیئے کہ ہماری جان کیوں نہ جلے، کہ ایک بار غلطی سے نہیں، بلکہ ہجے کی الٹ پھیر میں ہم "بجٹ" کو "بڈگیٹ" کہہ گئے، تو اسکول سے لے کر گھر تک، بلکہ پاس پڑوس والوں اور رشتہ داروں تک ہماری جہالت کے ڈنکے پٹ گئے۔ غلط ہجے پر جو ہمارا بے طرح مذاق اڑایا گیا، اس کا ہم نے اس وجہ سے زیادہ نوٹس نہ لیا کہ یہ وہی انگریزی داں حضرات و خواتین تھیں جن کے ہاتھ محض اتفاق سے ایک شوشہ آگیا تھا، ورنہ ان کے منہ سے ہم بارہا "نو" کو "کنو"۔ "رائٹ" کو "ورائٹ"۔ "ایمبیسڈر" کو "ایمبے سیڈر" اور "سائیکلوجی"

کو "پلسائی کیا لوگی" سُن چکے تھے۔

اس خوش فہمی میں طالب علمی کا زمانہ ہنس کھیل کر گذار دیا کہ تعلیم کا سلسلہ ختم ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی سے بھی "آٹومیٹی کلی" نجات مل جائے گی لیکن توبہ کیجئے، ایسی قسمت کہاں۔ پڑھائی کو خیرباد کہنے کے بعد پتہ چلا کہ انگریزی کے بہت سے الفاظ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ چکے ہیں، اور وہ بھی اس تیور کے ساتھ کہ ان کی ہجّے اور تلفّظ ہمیں صحیح آتے ہوں یا نہیں، لیکن ان کے قاعدوں اور ضابطوں کی پریڈ کا شدّت کے ساتھ پابندی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ان ہی میں ایک لفظ "ایٹی کیٹ" بھی ہے، جو اپنے اندر انگریزی زبان کا پورا تام جھام رکھتا ہے، بس جس وضعداری سے ہم انگریز کے جانے کے بعد بھی نہایت آزادی کے ساتھ ان کی وضع قطع اور تہذیب و تمدّن سے چمٹے ہوئے ہیں، اسی طرح ایٹی کیٹ بھی مع اپنے جملہ اصولوں اور ضابطوں کے ہماری جان سے چمٹا ہوا ہے۔ صاحب اس نے تو گلے پڑ کر ہمارا دیوالہ نکال دیا ہے۔

اب آپ ہی انصاف کیجئے، اتوار کا دن ہے، صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی عطر بیز ہوائیں چل رہی ہیں، اور آپ پر پورے طور سے اتوار منانے کا موڈ ہے۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے آپ مضمون نگار، افسانہ نگار، مزاح نگار یا مصوّرِ فطرت واقع ہوئے ہیں، بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ آپ نے خامہ فرسائی کے خیال سے میز کرسی جمائی۔ کاغذ، قلم، دوات سے لیس ہو کر عالم خیال میں پرواز شروع کر دی۔ آپ پر بہت زور و شور سے مضامین غیب نازل ہو رہے ہوں، خرمن کی خوشہ چینیوں کے لئے آپ قلم سے گھاس کاٹ رہے ہوں، خیالات کے سیلاب کے ساتھ قلم کا چھوٹا کشتی ادب کو روانی کے ساتھ چلا رہا ہو، آپ دُنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی دھن میں مست لکھے چلے جا رہے ہیں کہ یکایک آپ کے خیالات کو بریک لگ گیا، قلم ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا اور

وہ بھی محض اس لئے کہ آپ کے ناشدنی ملازم نے منہ سے لاؤڈ اسپیکر کا کام لیتے ہوئے آپ کے کان پہ یہ اعلان کر دیا کہ "آپ کے فلاں ملاقاتی آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں" لیکن بجائے اس کے کہ آپ اپنے نوکر اور آنے والے کا سر آپس میں ٹکرا دیں کہ وہ بھی یاد کریں کہ بے وقت کسی کے یہاں جانے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ بس آپ کے ذہن اور ایٹی کیٹ میں رسہ کشی شروع ہو گئی۔ ایٹی کیٹ نے آنکھ دکھائی "اخلاق کا تقاضا ہے کہ گھر آنے والے کا خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کیا جائے۔ اب ظاہر ہے جیت "ایٹی کیٹ" ہی کی ہوگی، کیونکہ آپ ایٹی کیٹ زدہ جو ٹھہرے اور "خوش آمدید" محض فریم میں لگا کر ڈرائنگ روم کی زینت بنانے کے لئے نہیں ہوتا۔ "ایٹی کیٹ" کے مطابق اسے ہونٹوں پہ بھی چسپاں کرنا ہوتا ہے، لہٰذا دل ہی دل میں لاکھ پیچ و تاب کھانے کے باوجود لبوں پر مسکراہٹ اور مجسم ایٹی کیٹ بنے باہر تشریف لایئے۔ آنے والے کی چائے یا شربت سے تواضع کیجیے، کم از کم گھنٹہ بھر ان کو خوش اور اپنے آپ کو بور کیجیے، اور جب وہ چلنے لگیں اور آپ کے خیالات بالکل منتشر ہو چکے ہوں تو ایک بار پھر آپ اسی روایتی ایٹی کیٹ سے کام لیتے ہوئے عرض کیجیے۔

"ارے بیٹھئے بھی، ابھی تو ٹھیک سے باتیں بھی نہیں ہو سکیں۔"

لیکن یقین جانیئے، اب آنے والا ہرگز نہ رکے گا، کیوں کہ اس کو تو موڈ خراب کرنا تھا، جو وہ کر چکا۔

ہمارے ساتھ ایک ٹریجڈی یہ بھی ہے کہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ایٹی کیٹ زدہ واقع ہوئے ہیں اور جہاں کہیں بھی ہمیں مہذب اور با اخلاق بننے کے زریں اصول نظر آتے ہیں، ہم فوراً انھیں اچھی طرح ذہن نشین کر لیتے ہیں، کیونکہ ملنساری بھی عجیب شے ہے۔

اب اسی دن کا واقعہ سنیئے، کہ مینا کے یہاں پارٹی میں اتفاق سے ہمیں ایک

شیوجی کی مسمّاۃ کے ہم صوفہ ہونے کا شرف حاصل ہو گیا۔ مینا کم بخت تو تعارف کرا کے چلتی بنی، مگر شامت مجھ غریب کی آ گئی۔

پہلے تو انھوں نے لحیم شحیم نہیں، بلکہ صرف لحیم جسم صوفہ پر کچھ اور پھیلا کر میری طرف غور سے دیکھا، کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد باتوں کا نہیں بلکہ سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ انھوں نے سب سے پہلے میری ولدیت کا اتہ پتہ لگایا، اس کے بعد مستقل پتہ دریافت کیا، پھر بھائی بہنوں کی تعداد کے بارے میں انکوائری کی اور میں نے ہر سوال کا جواب " ایٹی کیٹ " کے نپے تُلے الفاظ میں دیا۔ انھوں نے سوالوں کی تان اس پر توڑی " شادی ہو گئی ہے ؟" میں نے مذاقاً سنجیدہ مُنہ بنا کر کہا " نہیں " اس پر انھوں نے عجیب و غریب نظروں سے دیکھنا چاہا۔ ناچار اقرارِ جُرم کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی، غالباً ان کے پاس " ریڈی میڈ " سوالات کا اسٹاک ختم ہو چکا تھا یا شاید ان کا ذہن کوئی نیا سوال بُن رہا تھا، ان کے سوالوں کی بھرمار کے آگے میرا محض ہاں ہوں کرنا مجھے خلافِ تہذیب لگ رہا تھا، لہٰذا خیال ہوا کہ کچھ باتیں کی جائیں لیکن آخر کس موضوع پر؟ ادب، آرٹ، سیاست یا موجودہ مسائل پر ان سے بات کرنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے، اتنے میں خیال آیا کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ جس سے بات چیت کی جائے، اس کے خیالات، احساسات اور رُجحانات کو مدِنظر رکھا جائے تاکہ مخاطب بور نہ ہو (خواہ خود بور ہو رہے ہوں) اور یہ معلوم کرنے کے لئے اس کی باتوں، اس کی شخصیت اور خود اس پر توجہ دینا چاہیئے، بات چیت سے اتنا تو سونگھ ہی لیا تھا کہ ان کو ذاتیات میں زیادہ دلچسپی ہے اور ان کی ذات میں مجھے قیمتی زیورات، بھڑکیلی پوشاک اور جدید میک اپ کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا، لہٰذا میں نے بات چیت ان کے زیورات سے جو شروع کی تو وہ اپنے جسم کے پورے حدودِ اربعہ کے ساتھ کھسکتے کھسکتے اتنی کھسک آئیں کہ میں صوفہ کے ایک گوشہ میں

چپک کر رہ گئی۔ اگر مجھے ایٹی کیٹ کا لحاظ نہ ہوتا تو میں کب کی جگہ بدل چکی ہوتی اور مسلسل ڈیڑھ گھنٹے تک ان کی سروتے کی طرح چلتی ہوئی کھٹ کھٹ زبان کی بوریت کی تاب نہ لاتی۔

مگر یہ تو ایٹی کیٹ کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا، اسی طرح پچھلے ہفتہ جب مسز ہاشمی مع اپنے نصف درجن نٹ کھٹ بچوں کے ہمارے غریب خانہ پر نازل ہوئیں تو میں نے دل میں کہا۔

الٰہی خیر ـــــ آ گئی اب ڈرائنگ روم کی شامت، لیکن قربان جائیے ایٹی کیٹ کے، کہ دل کی آواز دبا کر چہرہ پہ نمائشی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے ان سے کہا "اوہو، آئیے آئیے۔ بہت دنوں کے بعد زیارت کا موقع دیا۔"

یقین جانئے ان کے پیارے پیارے بچوں نے (جی ہاں ایٹی کیٹ کی زبان میں ہر بچہ پیارا اور اس کی ہر بدتمیزی شوخی و ذہانت کہلاتی ہے) آتے ہی ڈرائنگ روم کا نقشہ بدل کر ہال کو کھیل کا میدان اور چیزوں کو کھیل کا سامان بنا دیا۔ صوفہ سیٹ ان کا جھولا بن گیا، جن پر کود کود کر وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہے، ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں، ان بیہودگیوں کو ایٹی کیٹ کی زبان میں شرارت کہا جاتا ہے لہٰذا ہم نے بھی اسے شرارت ہی سے تعبیر کیا اور جواب میں مسز ہاشمی سے ان ناشدنی لڑکوں کی لغویت (یعنی شرارت) کی داستان سنتے رہے کہ انھوں نے کہاں کیا توڑا پھوڑا اور ان کی ہنسی کا ساتھ بھی دیتے رہے۔ ان کے دفعان ہونے کے بعد جب ہم نفع و نقصان کا اندازہ کرنے بیٹھے، تو معلوم ہوا کہ نفع میں ہم ہی رہے، کیوں کہ نقصان محض ایک پھول دان، ایک ایش ٹرے اور چند رسالوں کا ہوا تھا، جبکہ دیواروں اور کارنس پر آویزاں تصویریں، منٹل پیس پہ رکھے ہوئے نازک آرائشی سامان، کمرہ میں رکھا ہوا فرنیچر اور کشن وغیرہ تو بچ گئے تھے، جس کے لئے ہم نے خدا کا

شکر ادا کیا۔ یہ اصول شاید آپ کی سمجھ سے بالاتر ہو، کہ کسی نئے آدمی سے ملاقات کے وقت یہ معلوم کیئے بغیر کہ یہ شخص بد ذوق ہے، احمق ہے یا ایکدم بور ہے، یہ کیسے کہہ دیا جاتا ہے کہ "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"۔ جبکہ زیادہ تر لوگوں سے ملنے کے بعد خوشی کی بجائے کوفت زیادہ ہوتی ہے، مگر چونکہ "ایٹی کیٹ" کے جملہ آداب میں اس کی بنیادی اہمیت ہے، اس لئے ہر نئے شخص سے متعارف ہوتے ہی اس کا دُہرایا جانا لازمی ہے۔

"ایٹی کیٹ" تو یہاں تک بتاتا ہے کہ اگر کوئی آپ کو ایک تھپّڑ مار دے یا آپ کے پیر کا قیمہ بنا دے تو فوراً "سوری" کہیئے، ورنہ سخت بدتمیز خیال کئے جائینگے اور اگر جان بوجھ کر بھی آپ کا پیر کچلنے والا "سوری" کہہ چکا ہو تو آپ جلدی سے کہیئے "کوئی بات نہیں"۔

ایٹی کیٹ میں یہ بھی آتا ہے کہ اپنی پسند ناپسند کا خیال کئے بغیر دوسروں کی چیزوں کی تعریف کرتے رہیئے۔ خاص طور پر معاملہ اگر کسی شاعر یا ادیب کی تخلیق کا ہو تو اس کی تعریف کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہے، بس بغیر سمجھے بوجھے واہ واہ کرتے چلے جایئے، بلکہ آپ کے حق میں زیادہ بہتر تو یہ ہوگا، کہ سننے کے ساتھ ہی رٹے رٹائے چند تعریفی کلمات مثلاً خوب خوب، بہت خوب، کیا کہنا، ارے سبحان اللہ، ماشاءاللہ، بھئی خدا نظرِ بد سے بچائے، وغیرہ کہتے چلے جایئے۔ ایٹی کیٹ کے کرشمے دیکھنے کے بعد اگر آپ ایٹی کیٹ زدہ ہیں تو اس مضمون کو نوٹس بنا کر پڑھیں گے، ورنہ مناسب ہے کہ اپنا عام اخلاق سنوارنے کے لئے ایٹی کیٹ پر لکھی ہوئی کتابیں پڑھیئے اور دوسروں کا دل رکھنا سیکھیئے۔ اب تو ایٹی کیٹ کا ایک ہی فرض شدت کے ساتھ یاد آرہا ہے کہ کسی سے اتنی دیر بات نہ کیجیئے، کہ وہ بور ہو جائے اور مجھے اس فرض کا پورا پورا احساس ہے، لہٰذا اب اجازت دیجیئے۔

اللہ شوق دے تو

"اللہ شوق دے تو کتابیں پڑھا کیجیے"۔

بہت خوب! کہنے والے نے کیا خوب بات کہی ہے لیکن اس بات کو اگر وہ مع اضافے کے یوں فرما دیتے، تو ان کا کیا بگڑ جاتا:

"اللہ شوق دے تو کتابیں خرید کر پڑھا کیجیے"۔

اس ذرا سے اضافے سے یہ مقولہ خوب سے خوب تر ہی نہیں خوب ترین ہو جاتا۔

اس اضافے کی خواہش مجھے اس شدت سے ہرگز نہ ہوتی اگر "باذوق" یا یوں سمجھیے کہ مطالعے کے شوقین حضرات و خواتین کی ٹولیاں میری چھوٹی موٹی لائبریری پر حملہ آور نہ ہوا کرتیں، اگر فاضل مصنف نے کتابیں خریدنے کی طرف ہلکا سا بھی اشارہ کر دیا ہوتا تو آج اس مقولے کو یاد کر کر کے مطالعے کے شوق کو جو لوگ اتنا عام کر رہے ہیں، وہ کتابیں خریدنے پر بھی ضرور مائل ہوتے۔

خوش قسمتی، بدقسمتی یا اتفاق سے ہم ایسے محلّے میں رہتے ہیں جو تعلیم یافتہ افراد کا علاقہ کہلاتا ہے اور جن میں اکثر کا ذوقِ مطالعہ دیوانگی کی حد تک پہنچ چکا ہے، لیکن کتابیں خریدنا ان کے نزدیک اتنا ہی غیر اہم ہے جتنا کہ مطالعہ اہم۔ لیکن اس کی سزا اکثر و بیشتر اس خاکسار کو بھگتنا پڑتی ہے، کیونکہ سہیلیوں، عزیزوں اور پڑوسنوں کے علاوہ محلّے کا محلّہ میری اس چھوٹی موٹی لائبریری کی سُن گُن رکھتا ہے۔

صاحب! مجھے کتابیں پڑھنے کے لئے دینے میں کبھی تکلف نہ ہوتا، بشرطیکہ عاریتاً جانے والی کتابیں اور رسالے مجھے پھر صحیح سلامت واپس مل جایا کرتے، لیکن

ان "باذوق" لوگوں کے سلیقے اور عادتوں سے آپ ذرا بھی واقف ہو جائیں تو پھر آپ مجھے ہی حق بجانب سمجھیں گے۔

مثال کے طور پر بیگم خان کو لیجیے۔ بھلا ان کی اس عادت سے کون واقف نہیں کہ ان کے وقت کا بیشتر حصّہ مطالعے کی نذر ہو جاتا ہے، آپ جب بھی ان کے گھر جائیں گے تو ان کو ایسی حالت میں پائیں گے کہ ان کی آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک چڑھی ہوگی اور ایک موٹی سی کتاب ان کے آگے کھلی رکھی ہوگی۔ یہی نہیں، بلکہ ان کے پلنگ پر اس سے ملی ہوئی میز پر، تخت، سلائی مشین، اسٹول، تپائی، پاندان، کرسیوں اور مکان کے ہر اس حصّے اور جگہ پر جہاں یہ لیٹ یا بیٹھ سکتی ہیں، آپ کو مانگے کی موٹی موٹی کتابیں اور رسالے کھلے اور بند رکھے ہوئے دکھائی دیں گے۔ چوں کہ وہ بہ یک وقت کئی کتابیں پڑھتی ہیں، اس وجہ سے ان کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ پڑھنے کے لیے ضروری نہیں، کہ کتاب شروع ہی سے پڑھی جائے۔ شروع، آخیر یا بیچ کہیں سے بھی وہ کتاب شروع یا ختم کر سکتی ہیں، اکثر وہ انجام جاننے کے لئے سب سے پہلے آخیر کا حصّہ پڑھ لیتی ہیں۔ اس طرح بقول ان کے تجسس اور اشتیاق ختم نہیں ہوتا، بلکہ کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ وہ بہ یک وقت کئی کتابیں پڑھتی ہیں، اس لئے جو کتاب وہ اس وقت نہ پڑھ رہی ہوں، اس میں سے کسی میں عینک کا خانہ، کسی میں کنجی کا گچھا، کسی میں قینچی، کسی میں قلم، کسی میں پنسل، کسی میں اسکیل، اور کسی بہت موٹی کتاب میں اور کچھ نہیں تو ایک پتلی سی کتاب یا رسالہ بطور "بک مارک" رکھا ہوتا ہے۔ اس ہیئت کذائی میں ان کو، ان کے گھر کو اور اس کی تعلیمی فضا کو دیکھ کر شبہہ ہوتا ہے کہ یہ مسز خان نہیں، بلکہ پڑھنے کی کوئی فیکٹری ہیں، مگر ایسے ماحول میں خود کتاب کا وجود کتنے خطرے میں رہتا ہے، یہ آپ خود بخوبی سمجھ سکتے ہیں مسز خان میں لاکھ روپے کی خوبی یہ ہے کہ وہ کتابیں واپس کرنے کے معاملہ میں بہت ذمہ دار ہیں، مگر یہ دوسری بات ہے کہ کتاب بہت ہی خستہ یا ٹوٹی پھوٹی حالت میں واپس

ہوتی ہے۔ کبھی جلد کھلی، کبھی اوراق تاش کی گڈی کی طرح پھینٹے ہوئے اور کبھی کور الگ، ٹائیٹل الگ ——

ہمارے ایک پڑوسی ہیں، جنھیں اگر کتاب کا کیڑا کہا جائے، تو بے جا نہ ہوگا ہمیشہ نئی نئی کتابوں کی جستجو میں سرگرداں رہتے ہیں۔ کتابیں اور رسالے پڑھنے کا جتنا خبط ہے، اتنا ہی کتابیں اور رسالے خریدنے سے بے نیاز۔ ایک دم مفت لال۔ کتابیں پڑھ کر واپس ضرور کرتے ہیں، خواہ اس کی مدّت ایک ہفتہ سے لے کر ایک سال تک ہو، کتاب پڑھنے میں بہت پکّے ہیں، پوری کتاب پڑھے بغیر کیا مجال جو لوٹا دیں، خواہ آپ ان پر تاکید کی ڈاک بٹھا دیں، ان کا گھر گھیر لیں یا ستیہ گرہ کروا دیں، مگر یہ اپنی جگہ پہ قائم رہیں گے، اور جب کتاب واپس کریں گے، تو اس کی جلد امیّد سے بڑھ کر بہتر ہوگی، اس پر انھوں نے احتیاطاً اخبار بھی چڑھایا ہوگا، کہ کتاب پرائی ہے، کہیں اس کی جلد میلی نہ ہو جائے، لیکن اندر کی حالت نہ پوچھیے، ان کی چاندماری کی وجہ سے ساری کتاب خوناخون ہوگی، اور سُرخ روشنائی کی زد میں آکر وہ کتاب سے زیادہ میدان جنگ کے مقتولین کا ایک نظارہ پیش کرتی ہوگی۔ جا بجا عبارت خطِ کشید، توسین اور واوین میں گھری ہوگی۔ حاشیہ آرائی کے ساتھ قاتلانہ نوٹس بھی پائے جائیں گے، کتاب واپس ملنے پر صاحبِ کتاب اسے دیکھ کر یہی سمجھیں گے، کہ انھوں نے نہ صرف اسے پڑھا ہے، بلکہ باقاعدہ سالانہ امتحان کی تیّاری بھی اس کی مدد سے کی ہے۔ موصوف کی قابلیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی نظر میں کوئی مضمون یا کتاب غلطیوں سے پاک نہیں، انھیں کہیں کاتب کی غلطی نظر آتی ہے، کہیں مصنّف کی، تو کہیں ایڈیٹر کی، لہٰذا وہ کتاب کے مالک اور آئندہ اس کے پڑھنے والوں پر کرم کرتے ہوئے ان غلطیوں کو اپنی مخصوص سُرخ روشنائی سے کاٹ کر تصحیح کرنا اپنا اوّلین فرض سمجھتے ہیں۔ اس طرح کتاب ان کے یہاں سے اچھے خاصے نوٹس کی شکل میں واپس آتی ہے۔

اب لکھنے لکھانے کی بات آئی، تو ہماری ایک اور "کرم فرما" کا حالِ زار سنیئے، اور عبرت پکڑیئے، کہ وہ مانگے کی کتاب پر طرح طرح کے حساب کتاب، یادداشتیں، اور ریڈیو پروگرام وغیرہ باقاعدہ نوٹ کرتی ہیں۔ شاید آپ آسانی سے یقین نہ کریں، لیکن یہ ایک کھلی حقیقت ہے، کہ جب ان کے یہاں سے ہماری ایک کتاب چھ ماہ کی قید بامشقت کاٹ کر چھوٹی، تو اس کے آخری صفحے پر دھوبی کو دیئے گئے کپڑے لکھے تھے، ایک صفحہ کی خالی جگہ پر لکھا ہوا تھا: ریڈیو مشاعرہ: ۴ مارچ ساڑھے نو بجے"، ایک جگہ درج تھا۔" زنانہ میلاد شریف بخانہ، بیگم انور اٹھارہ مارچ بوقت، ۷ بجے شب اس کے علاوہ کتاب پر جا بجا بے تکے اشعار تھوپے گئے تھے اور کہیں کہیں فلمی گانے اور قوالیاں درج تھیں۔

حمید صاحب کے مطالعہ کا خبط جنون کی حدیں پھلانگ چکا ہے، بس وہ ہوتے ہیں اور ان کی کتابیں (شاید میں نے غلط کہا" ان کی" نہیں بلکہ دوسروں کی) حالت یہ ہے کہ کھا رہے ہیں داہنے ہاتھ سے تو بائیں ہاتھ میں کتاب ہے، خود اگر کرسی پر بیٹھے ہیں تو میز پر کتاب ہے، یا لیٹے لیٹے پڑھتے سو گئے، اب کتاب ان کے منہ یا سینے پر کھلی رکھی ہے، یا بے خبری میں اسی پر تکیہ کئے ہوئے ہیں۔ کتاب کا ذائقہ بڑھانے کے لئے اس میں چائے، کافی، دال اور سالن وغیرہ کی خوشبو اور نشانی کے طور پر ہر قسم کے داغ دھبے ملیں گے۔

اس دن جب بیگم نقوی نقوش کا سالنامہ جلدی ہی واپس کر گئیں تو دل ہی دل میں مجھے ان کی نفاست کی داد دینا پڑی، کیونکہ مانگنے والے جب رسالے واپس کرتے ہیں، تو ان کا سرورق گھس گھسا کر غائب ہو چکا ہوتا ہے، یا کثرتِ استعمال سے پھٹ پھٹا کر برائے نام رہ جاتا ہے۔ لیکن اس کا ٹائیٹل صحیح سلامت جوں کا توں بالکل نیا چمچماتا ہوا تھا، اتنی اچھی حالت میں پرچہ واپس ملنے پر میں نے خاص طور پر شکریہ ادا کیا، لیکن ان کے جانے کے بعد رسالہ کھول کر جو دیکھا، تو دل پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس میں سے

ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی تصویریں اور ان کے حالاتِ زندگی غائب غلہ ہو چکے تھے، بعد میں پتہ چلا، کہ ان کی بڑی صاحبزادی پہ آج کل ادیبوں اور شاعروں کا البم بنانے کا خبط سوار ہوا ہے، لہٰذا وہ اس خالص ادبی ذوق کی تکمیل کے لئے تصویریں جمع کر رہی ہیں اور ان کے اس شوق کی زد میں میرا رسالہ بھی آگیا۔ بیگم نقوی نے کچھ اس جوش و خروش کے ساتھ اپنی دخترِ نیک اختر کی اس ہابی کی تعریف اور حوصلہ افزائی کی، کہ اس کے بعد کچھ کہنا بدمذاقی تھی۔

کتابیں مانگنے والوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اس مقولے پر عمل کرتے ہیں :-

"کتابیں عاریتاً کسی کو دینے والا احمق، اور اُسے پڑھ کر واپس کرنے والا اس سے بھی بڑھ کر احمق ہوتا ہے۔"

ایسے اصحاب کے یہاں سے کتابیں مانگنے پر ملنے کی کس کم بخت کو امید ہے؟ اپنی گئی ہوئی کتاب ہی واپس منگا لینا کارے دارد۔ اشارۃً اور پھر بار بار تقاضا کرنے پر بھی جب کتاب نہیں ملتی، تو صبح و شام کو ان کے گھر نوکر کے پھیرے کروانے پڑتے ہیں، اس بے چارے کی اچھی خاصی شامت آجاتی ہے، اِدھر سے اُدھر دوڑایا جاتا ہے اور اُدھر کی لعنت ملامت کا نشانہ بھی اسے بھی بننا پڑتا ہے، اس کے بعد بھی کوئی شرط نہیں کہ کتاب واپس مل ہی جائے۔ اس کے باوجود یہ لوگ اتنے گھاگھ ہوتے ہیں، کہ لاکھ حفاظت کے بعد بھی ان سے ہر وقت خطرہ رہتا ہے، کہ پھر کوئی اور کتاب نہ ہتھیالیں۔

ہمارے ایسے بھی ملاقاتی ہیں، جو "من و تو" کے جھگڑے میں پڑنا پسند نہیں کرتے، اس لئے وہ اپنی اور دوسروں کی چیزیں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے، لہٰذا ان کے یہاں "مانگے" گئی ہوئی کتابیں مہینوں پڑی رہتی ہیں۔ بار بار آدمی بھیج کر منگوانے کے بعد اگر کبھی خود دبی زبان سے کتاب مانگ بیٹھے تو نہایت بے پروائی اور معصومیت کے ساتھ چونک کر ارشاد فرماتی ہیں "ارے وہ کتاب؟ اچھا وہ آپ کی ہے، وہ تو

مہینوں سے میرے بُک شیلف میں پڑی ہوئی ہے، میں سمجھی تھی گھر میں کوئی خرید کر لایا ہے۔ آپ نے پہلے بتا دیا ہوتا۔ خیر دیکھا جائے گا، میں نے تو ابھی وہ کتاب پڑھی بھی نہیں ہے"

قربان جائیے اس سادگی، بے پرواہی اور غیر ذمہ داری کے۔ بعض اوقات تو سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے کہ کتاب خود مانگ کر لے گئیں اور اب الزام ہمارے سر ہے کہ ہم نے اس کتاب کی تاریخ اور جغرافیہ سے اب تک انھیں آگاہ کیوں نہ کیا۔

بیگم خالد کے یہاں بھی تو کتابیں منگوانے کے لئے بار بار آدمی دوڑانا پڑتا ہے جو ان کے ڈھیری بھر بچوں میں کھو چکی ہوتی ہے۔ دو تین بار تو کر یہ جواب لانے کے بعد کہ "ڈھونڈ کر بھیج دیں گے" جب کتاب واپس لاتا ہے، تو اس کی ایسی درگت بنی ہوتی ہے کہ اپنی ہی کتاب پہچان نہیں پاتے۔ اس میں جہاں کہیں ذرا سی سادہ جگہ ہوتی ہے وہاں انواع واقسام کے کارٹون، رنگ برنگی تصویریں (جو جانوروں سے لے کر انسانوں تک پر مشتمل ہوتی ہے) فقرے بازیاں، ٹھمری، فلمی گانے اور غزلیں وغیرہ درج ہوتی ہیں، اور اگر کتاب باتصویر ہے، تو ان کے چہرے، داڑھی مونچھوں سے مزیّن ہوتے ہیں، اگر سیٹریاں ہیں تو ان میں رنگ بھرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ پوری کتاب تو شاید ہی کبھی ان کے گھر سے واپس ملی ہو۔

بچپن میں ہمیں جغرافیہ کے گھنٹے میں دنیا گول ہونے کے ثبوت رٹائے جاتے تھے، ان میں ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ ایک آدمی اگر اپنے گھر سے ناک کی سیدھ میں چلتا چلا جائے تو ایک نہ ایک دن ورنہ رات میں وہ اپنے گھر واپس پہنچ جائے گا، لہٰذا ثابت ہوا، کہ دُنیا گول ہے۔ (حالاں کہ اگر دُنیا چوکور ہوتی، تب بھی وہ لوٹ کر اپنے گھر پہنچ سکتا تھا) اس زمانے میں خدا جانے ہم اس ثبوت کے قائل ہوئے یا نہیں، لیکن آج کتاب عاریتاً دینے کے سلسلے میں کم از کم اتنا تو قائل ہونا پڑا کہ دنیا گول ہو یا نہ ہو لیکن اپنا شہر ضرور گول ہے، کیونکہ کبھی کبھی کتاب ایسے ہاتھوں میں بھی پہنچ جاتی ہے کہ جب آپ ان سے مانگیں،

یا منگوائیں تو جواب ملتا ہے:

"وہ تو میرے فلاں دوست لے گئے ہیں، واپسی پر مل جائے گی۔"

اور جب فلاں دوست کے یہاں سے پچھوایا تو معلوم ہوا کہ کتاب وہاں سے کسی اور دوست کے پاس پہنچ چکی ہے، غرض وہ کتاب کئی ہاتھوں اور محلّوں کا گشت کرنے کے بعد میرے گھر واپس پہنچتی ہے، اس صورت میں کتاب کس حالت میں ہوتی ہے، یہ پوچھنے کی بات نہیں۔

تو جناب یہ ہے ہمارے ان دوستوں، ملاقاتیوں اور پڑوسیوں کی علم پروری اور عنایت کی چند جھلکیاں جو وہ گاہے بگاہے اس خاکسار پر کتابیں مانگنے کے سلسلے میں فرماتے رہتے ہیں ——

ان کی عنایتوں کی وجہ سے ان کی لائبریریاں بنتی جارہی ہیں اور ہماری لائبریری تقریباً روز بروز غائب ہوتی جارہی ہے، اس صورت میں آپ ہی بتایئے میں اس مقولے میں اضافے کی خواہش کیوں نہ کروں، جس سے مجھے یقین ہے کہ لوگ اگر اس پر عمل کریں گے تو میرا ہی نہیں، بہتوں کا بھلا ہوگا۔ لہٰذا ایک بار پھر کان کھول کر سُن لیجیے:

"اللہ شوق دے تو کتابیں خرید کر پڑھا کیجیے۔"

جنونِ لطیفہ

لطیفہ کا جنون بھی کیا جنون ہوتا ہے صاحب۔ معاف کیجیے گا، لطیفہ کا نہیں، لطیفہ گوئی کا جنون۔ جنونِ لطیفہ کے مریض کی پہچان یہ ہے کہ وہ خود کوئی لطیفہ سُننا پسند نہیں کرتا۔ بفرضِ محال اگر اس نے ایک لطیفہ جبراً قہراً سُن بھی لیا تو اس کے بدلے بلا مبالغہ آپ کو ستر لطیفے سُنائے گا۔ اکثر کا جنون تو اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ وہ دوسرے کے مُنہ سے لطیفے چھین لیتے ہیں اور بڑی تیز رفتاری کے ساتھ اگلنے لگتے ہیں، فرض کیجیے آپ نے کسی محفل میں لطیفہ سُنانے سے پہلے ازراہِ اخلاق پوچھا۔

"آپ لوگوں نے وہ لطیفہ سُنا ہے؟"

"کون سا؟"

"وہ ریچھ اور کمبل والا۔"

"ارے ہاں، وہ لطیفہ بھی خوب ہے۔"

یہ کہہ کر جنونِ لطیفہ میں گرفتار صاحب فوراً وہ لطیفہ پورے کا پورا سنا دینگے اور آپ "واہ" کی جگہ "آہ" کرکے رہ جائیں گے۔

ایک محفل میں ایک صاحب ایک لطیفہ سُنا رہے تھے

"ایک بار تین امریکن ایک ہوٹل کی سب سے نچلی منزل میں کھانا کھانے کے بعد پندرہویں فلور پر اپنے کمرے میں جانے لگے۔ اتفاق سے لفٹ خراب تھی۔ لہٰذا وہ زینہ طے کرکے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک امریکن ایک زینہ طے کرتا اور ہنسنے لگتا۔ کئی بار کئی امریکنوں نے پوچھا کہ کیا بات ہے، لیکن ہر بار وہ ہنستے ہوئے کہتا" اوپر چل کر بتاؤں گا تب مزا آئے گا"

"آگے میں بتاتا ہوں"

ایک صاحب تڑپ کر بولے اور شروع ہو گئے سو الفاظ فی سیکنڈ کے حساب سے۔

"جب وہ پندرہویں فلور پر ڈھائی تین سو زینے طے کر کے تقریباً غشی کی حالت میں نڈھال پہنچے، تو تیسرا امریکن پیٹ پکڑ کر ہنستے ہوئے بولا۔

"چابی تو ہم نیچے کھانے کی میز پر ہی بھول آئے"

ایک صاحب نے جو فنِ لطیفہ گوئی پر عبور رکھتے ہیں۔ ایک بار بتایا۔

"صاحب، اب تو عالم یہ ہے کہ لوگ ہمارا ہی لطیفہ یہ کہہ کر کہ "جناب آپ کا وہ لطیفہ خوب تھا" من وعن سنا دیتے ہیں، پھر دادِ طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے میرے ہنسنے کی اُمید رکھتے ہیں، لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ میں اپنے ہی لطیفے پر داد دوں ہنسوں یا روؤں"

بدقسمتی سے اگر کوئی افسر لطیفہ گوئی کا بیمار ہوا تو سمجھ لیجیے، کہ بے چارے ماتحتوں کی مصیبت آگئی، کیوں کہ صاحب کے روکھے پھیکے، گھِسے پٹے لطیفوں (جس پر ہنسنا تو ہنسنا، رونا بھی نہ آسکے) کو سُن کر ان بے چاروں کو اپنی نوکری برقرار رکھنے کے لئے دیوار قہقہہ بننا پڑتا ہے، ایک دفتر کے حاکمِ اعلیٰ بھی اس مرض میں مبتلا تھے اور اکثر اپنے ماتحتوں کو بور کیا کرتے تھے۔ ایک دن اسی طرح لطیفہ گوئی ہو رہی تھی اور افسر صاحب کے بلند و بانگ قہقہوں کے ساتھ ان کے اسسٹنٹ صاحبان بھی قہقہے میں قہقہہ ملا رہے تھے لیکن ایک صاحب غیر معمولی طور پر بالکل خاموش اور بے توجہ بیٹھے رہے۔ کسی نے پوچھا "آپ کیوں خاموش ہیں؟" وہ صاحب برجستہ بول پڑے۔

"میں کیوں ہنسوں، میں تو کل سے ریٹائر ہو رہا ہوں"

بور کرنے کی نہ کہیے، وہ اناڑی لطیفہ گو حضرات بھی کچھ کم بور نہیں کرتے، جو کوئی بہت ہی پرانا لطیفہ اپنی بیتی کے طور پر آپ کو سُناتے ہیں مثلاً ایک بڑے ہی مسکین شکل والے

صاحب سمسا سا سوکھا چہرہ بنا کر کہتے ہیں۔

"جناب کل ایک دلچسپ واقعہ ہو گیا۔ میں اپنی ٹوٹی گھڑی لے کر گھڑی ساز کے یہاں گیا، وہ اس میں ایک مرے ہوئے مچھر کو دیکھ کر بے ساختہ بول پڑا۔ "ارے اس کا ڈرائیور تو مر گیا ہے، چلے کیسے؟" اب آپ کے ساتھ بدقسمتی یہ ہو گی، کہ آپ ان کو یہ کہہ کر بور بھی نہیں کر سکتے، کہ یہ لطیفہ بچپن سے آج تک صدہا بار سُن چکے ہیں کیونکہ وہ صاحب آپ کے بزرگ ہیں۔

لیکن ان باتوں سے آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا، کہ صرف لطیفہ سنانے والے ہی آپ کو بور کرتے ہیں، میرا تجربہ تو یہ ہے کہ بعض اوقات سننے والے کچھ زیادہ ہی بور کرتے ہیں، آپ نے یہ تو سُنا ہو گا، کہ ایک بیوقوف ایک لطیفہ سُن کر تین بار ہنستا ہے ایک بار تمام لوگوں کے ساتھ، دوسری بار اُسے سمجھ کر اور تیسری بار اپنی بیوقوفی کو یاد کر کے (اچھا، آپ بلا شرمائے بتایئے کہ ایک لطیفے پر آپ کتنی بار ہنستے ہیں۔) اس کی تو یہ خوش قسمتی ہے کہ ایک ہی لطیفہ پر وہ تین بار ہنس لیتا ہے، لیکن اپنا یہ عالم ہے کہ کسی بیوقوف کو لطیفہ سُنا کر تین ہی بار نہیں، بلکہ زندگی بھر رونے کو جی چاہتا ہے، اگر آپ لطیفہ گو ہیں، تو آپ کو معلوم ہو گا کہ رونا کب آتا ہے اور ہنسنا کب۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں نے چند بزرگوں کے سامنے ایک لطیفہ سُنانا شروع کیا، لطیفہ تھا:

"ایک بار ایک اسکاٹ ایک بس میں ایک بہت بڑا تھیلا لے کر سوار ہوا، کنڈکٹر نے اس تھیلے کا بھی ٹکٹ خریدنے کو کہا۔ وہ صاحب پہلے تو کنڈکٹر سے جھگڑتے رہے، پھر بڑی مشکل سے نصف ٹکٹ خریدنے پر راضی ہوئے لیکن جب کنڈکٹر کسی طرح راضی نہ ہوا تو انھوں نے تھیلا کھول دیا اور بولے۔

"بیگم باہر نکل آؤ۔ اگر پورا ٹکٹ ہی خریدنا پڑے، تو پھر تھیلے میں بند رہنے کی

کیا ضرورت ہے"۔

لطیفہ سُننے کے بعد کمرہ قہقہوں یا ہنسی کی آواز سے نہیں، بلکہ اعتراضات کی گولہ باری سے گونج اٹھا۔

— یہ لطیفہ سرے سے غلط ہے، کیونکہ کسی انسان کو تھیلے میں بند کر کے اتنی دیر تک نہیں رکھا جا سکتا، اس کا دم گھٹ جائے گا۔

— ایک دو ڈھائی من کی عورت کو کندھے پہ اُٹھائے رکھنا صرف مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

— اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ بکس یا بستر وغیرہ لے کر بس میں سفر کرتے ہیں، اس لئے کنڈکٹر کا بحث کرنا ہی فضول تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

بزرگوں کی ایک خاص قسم وہ ہوتی ہے جو لطیفہ سُن لینے کے بعد ہنسنے یا محض مسکرا دینے کی بجائے سنجیدگی سے پوچھتی ہے "پھر کیا ہوا" یا "اُف، اس کو ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا" یا یہ کہ "غلطی اسی کی تھی"۔

ایک بار ایسے ہی ایک خطرناک بزرگ کی موجودگی میں، میں ایک لطیفہ سُنا رہی تھی؛

"ایک کسان کی بھینس بیمار ہو گئی، وہ دوسرے کسان کے پاس گیا اور پوچھا،

— پارسال تمہاری بھینس بیمار ہوئی تھی، تو تم نے اس کو کیا دوا دی تھی؟"

دوسرے کسان نے جواب دیا "میں نے اپنی بھینس کو بھلاوہ کوٹ کر کھلا دیا تھا"۔

پہلا کسان گھر گیا اور اپنی بھینس کو بھلاوہ کوٹ کر کھلا دیا۔ بھلاوہ کھاتے ہی اس کی بھینس تڑپنے لگی اور تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ اس پر اس کسان کو بہت تاؤ آیا وہ اسی وقت دوسرے کسان کے پاس گیا اور بگڑ کر بولا۔

"تم نے اچھی دوا بتائی، میری بھینس بھلاوہ کھاتے ہی مر گئی"۔

"مگر تو میری بھی گئی تھی۔" دوسرا کسان بولا۔

"پھر تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔" پہلے نے شکایت کی۔

"تم نے پوچھا کب تھا؟ پوچھتے تو بتا دیتا۔" دوسرا معصومیت سے بولا۔

لطیفہ نہایت غور سے سننے کے بعد ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے ان بزرگ نے فرمایا۔

"افسوس! کسان کی بے وقوفی سے ایک بے زبان کی جان گئی۔"

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ خواتین کے ایک مجمع میں مجھے ایک لطیفہ سُنانے کا موقع ملا۔ ہال میں خواتین کی پُرشور باتوں کی آواز سے کان پڑی آواز نہیں سُنائی دے رہی تھی گلے لاؤڈ اسپیکر بنے ہوئے اور ہر معزز خاتون اپنی آواز کو دوسری خاتون کی آواز پر حاوی کرنے کے لئے پوری زور آزمائی کر رہی تھی، ایسے میں میری رگِ لطیفہ پھڑکی، اور اپنی بغل میں بیٹھی اپنی عزیز دوست یاسمین کو لطیفہ سنانے لگی۔ سُن کر وہ زور سے ہنس پڑیں ان کی بغل میں بیٹھی ہوئی ایک فیشن ایبل خاتون شمیم بیگم نے پوچھا۔

"کیوں، کیا ہوا، کاہے کی ہنسی ہو رہی ہے؟"

یاسمین بولیں —

"انھوں نے ایک لطیفہ سُنایا تھا۔"

"اچھا! مجھے بھی تو سُنایئے۔"

"سُنیئے:

ایک بار ایک محفل میں ایک بائی جی......!"

"کس بائی کا ذکر ہو رہا ہے، میں بھی تو سُنوں۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"جی! یہ ایک لطیفہ ہے۔"

"اچھا! اچھا!! ہمیں بھی تو سُنایئے!"

"جی ہاں! تو میں کہہ رہی تھی — ایک بار ایک محفل میں ایک بائی جی ڈھیر سا

زیور پہنے ......"

"ارے، یہ کہیں نظیر بائی کا ذکر تو نہیں، جن کے زیورات ایک شادی سے واپسی میں لوٹ لئے گئے" ایک کونے سے زوردار سی آواز آئی۔

"جی نہیں، یہ ایک بائی جی کا لطیفہ ہے... "

" اوہ! اچھا تو پھر کیا ہوا؟"

" ہاں تو وہ گا رہی تھیں ـــــ میں بن میں اکیلی پھرتی تھی"

"بہت خوب! آگے کیا قصہ ہوا؟"

" پھر یہ ہوا کہ ایک پشاوری خان دہاڑیں مار مار کر رونے لگا"

میں جھلا کر بولی

" ارے یہ کیوں؟ ـــــ چچ چچ ـــــ اس پر کیا بیتا پڑی؟"

" چچ چچ " کی آوازیں دو تین طرف سے ابھریں، اور اس بلے والے کے لطیفوں میں لطیفے کے خاتمے سے پہلے ہی پوسٹ مارٹم ہو گیا۔

ایک بار ایک محفل میں ایک صاحب ایک لطیفہ سنا رہے تھے

"ایک دولت مند کی بیوی نے اپنے شوہر کے مر جانے کے فوراً بعد اپنے مالی کو پلنگ پر لٹا کر اس پر چادر ڈال دی۔ پھر اپنے وکیل کو بلوا کر اس کی وصیت لکھوانے لگی۔

مالی نے کراہتے ہوئے دھیمی آواز سے کہا۔

" میں اپنی جائداد کا نصف حصّہ اپنی پیاری بیوی کو دیتا ہوں"

پھر وکیل نے پوچھا،

" اور باقی نصف؟"

" وہ اپنے وفادار مالی کو"

"عجیب عجیب!"

ایک فلک شگاف آواز کمرے میں گونج اُٹھی۔

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ آپ نسائیت کی بھرپور توہین کر رہے ہیں۔ ایک عورت کبھی ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کر سکتی۔"

پوری محفل اس لطیفہ کی بجائے اس آواز کی طرف متوجہ ہو گئی، جو ایک بھاری بھرکم خاتون کی زبان سے نکل رہی تھی۔ ساری خواتین اور چند بزرگ صاحبان ان بھاری بھرکم خاتون کے ہمنوا بن گئے آج کل کے نوجوانوں کی خوب مذمت کی گئی حتیٰ کہ اس محفل کی دو پارٹیاں ہو گئیں۔ ایک پارٹی عورت کی وفاداری کی حمایت میں، اور دوسری پارٹی بے وفائی کی حمایت میں۔

مجھے تو اب یہ ڈر لگ رہا ہے، کہ قارئین کہیں اس خاکسار کو بھی جنونِ لطیفہ کا بیمار نہ سمجھ بیٹھیں، کیوں کہ باتوں ہی باتوں میں میں نے بھی بہت سے لطیفے سنا دیئے آپ کہیں یہ نہ کہہ بیٹھیں، کہ لطیفے سنانے کی اچھی ترکیب نکالی، ٹھیک اسی لطیفے کی طرح:۔

ایک صاحب کے بچے حساب پڑھنے سے بہت بھاگتے تھے۔ انھوں نے کئی ٹیوٹر رکھے، لیکن حساب پڑھانے میں کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر ایک ماہرِ نفسیات نے دعویٰ کیا کہ وہ انھیں پڑھا دیں گے۔

دونوں لڑکے باغ میں کھیل رہے تھے، کہ یہ صاحب پہنچے۔ بچوں کے دل سے خوف دور کرنے کے لئے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے،

پھر انھوں نے پوچھا۔

"اچھا بچے! تم کتنے بھائی بہن ہو؟"

ایک نے بتایا "سات"

پھر انھوں نے پوچھا "کتنی بہنیں ہیں؟"

وہ بولا "تین"

"اور کتنے بھائی ہیں؟"

اس نے جواب دیا "چار"

دوسرا لڑکا جو خاموشی سے یہ سوال جواب سن رہا تھا، چپکے سے پہلے لڑکے کے کان میں بولا۔

"ارے بھاگو، یہ تو باتوں ہی باتوں میں ہمیں حساب پڑھا رہا ہے!"

لہٰذا پیشتر اس کے کہ آپ بھاگیں، مجھے رخصت ہو جانا چاہیے۔

بزمِ خواتین

اس عنوان کے تحت بہنوں کی مرسلہ صرف ایسی خبریں شائع کی جاتی ہیں جو شادی، غمی، ولادت یا چھوٹی موٹی کامیابی کے سلسلے میں دور دراز کے اعزہ و قریبی دوستوں سے متعلق ہوں۔ خبروں کا صاف ستھرا ہونا ضروری نہیں، کیوں کہ ہمارا کاتب کٹی پھٹی خبروں کو بھی کچھ ترمیم کے ساتھ صاف کر لینے میں مہارت رکھتا ہے۔ نمبر خریداری کا لکھنا بھی کوئی ضروری نہیں، کیوں کہ ایسی خبروں کی توسیع و اشاعت ہمارا اوّلین فرض ہے، تاکہ بہنیں انھیں پڑھ کر مسرت و عبرت حاصل کر سکیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو سکیں۔ ادارہ

بہن تہذیب خانم ستا گھنی سے تحریر فرماتی ہیں :

"اللہ تعالیٰ نے بندہ زادی کو بروز منگل، بتاریخ چودہ شعبان بمطابق دس جون سال رواں ایک پوتی سے نوازا ہے، لڑکی کا رنگ ماں پر اور نقشہ باپ پر گیا ہے۔ آپ بہنوں سے استدعا ہے، کہ اس کی درازیٔ عمر کی دعا کریں، تاکہ وہ بھی میری طرح پڑپوتی کی مالک بنے، سسرال میں اچھا گھر و بَر نصیب ہو۔ آمین "

کوہ ندا سے کریمہ بہن لکھتی ہیں :

"بہنوں کو یہ خبر پڑھ کر دلی مسرت ہوگی، کہ کل میری پیاری پڑوسن کی دختر نیک اختر کی چھیدن کی رسم ادا ہوئی۔ اس سلسلے میں ایک تقریب بڑی دھوم دھام سے منائی گئی جس میں شہر کے بڑے بڑے لوگوں نے شرکت کی اور امید سے بڑھ کر تحفے وصول ہوئے۔ خدا کا

لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری پڑوسن ایک اہم فرض سے سبکدوش ہو گئیں ؟

محترمہ فضیحت خانم صاحبہ کلسر سے خبر دیتی ہیں:

"میرے نورِ نظر لختِ جگر نے اس سال K.G.I کا سالانہ امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا ہے۔ برخوردار کی عمر محض دس سال ہے، اس نے اتنی کم عمری میں ایسی شاندار کامیابی حاصل کر کے اپنے خاندان کا گذشتہ ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ اس کی اس عظیم کامیابی پر اپنے پیارے بچے کو ایک خریدار پیش کر رہی ہوں۔"

محترمہ حکمت آرا بیگم سنولی سے انتہائی مسرت کے ساتھ اس بات کی اطلاع بہنوں کو دے رہی ہیں کہ گذشتہ ہفتہ ان کے گھر ایک معرکۃ الآرا جنگ ساس بہو کے درمیان ہوئی، اگرچہ مقابلہ سخت اور برابر کا تھا، لیکن اس کے باوجود فتح ان کی یعنی بہو کی ہوئی، یہ صرف ان ہی کے لئے نہیں، بلکہ پوری بہو خواہری کے لئے فخر کی بات ہے، اپنی اس شاندار کامیابی پر وہ دس روپے نادار بہنوں کے لئے بھیج رہی ہیں تاکہ سال بھر کے لئے ان کے نام رسالہ جاری کر دیا جائے۔"

تمسر سے ام کلثوم صاحبہ تحریر فرماتی ہیں:

"میں نہایت رنج و اندوہ کے ساتھ یہ خبر سپردِ قلم کر رہی ہوں کہ میری حقیقی نند کے چچازاد سسرِ محترم کے والد بزرگوار اپنی زندگی کی صد سالہ سالگرہ منا کر بروز ہفتہ بتاریخ ۱۵ر جولائی بوقت بارہ بجے شب اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ حیف کہ اپنے پوتے پوتیوں کی اولادوں کی خوشیاں نہ دیکھ سکے۔ ع

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

بہنوں سے گذارش ہے کہ وہ مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لئے کم سے کم ایک ختم قرآن پاک کا کر کے ان کی روح کو ثواب پہنچائیں، اور خود ثوابِ دارین حاصل کریں۔"

(ادارہ آپ کے غم میں برابر کا شریک ہے ـــــ ادارہ)

محترمہ قاضیہ خاتون صاحبہ جھانکی سے فرماتی ہیں :

"میرے خالو کی پھوپھی کے چمنستانِ حیات میں دس بچّوں کے بعد گیارہویں بچّے نے پھول کھلا کر ایک ٹیم کو مکمّل کیا ہے۔ خدا نومولود کو پوری ٹیم کے ساتھ زندہ رکھے دنیا تک قائم رکھے اور کسی طرح کا غم و فکر ان کی خوشیوں پر فتح نہ پائے۔ آمین ثم آمین"۔

محترمہ حسین بانو صاحبہ جکڑا سے لکھتی ہیں :

"میرے ہونٹ موٹے اور دانت لمبے ہیں۔ ہنسی ہوں تو بُری لگتی ہوں، بہن کوئی آزمودہ علاج بتائیں"۔

(جواباً) عرض ہے کہ ہنسنا یا مسکرانا بالکل چھوڑ دیں۔ آپ اچھی لگنے لگیں گی، آزمودہ ترکیب ہے —۔ (ادارہ)

بہن گوہر دانہ صاحبہ بکھیر پوری سے لکھتی ہیں —

"میرے سگے دیور کے خسر صاحب کے حقیقی بڑے بھائی عین عالمِ جوانی میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ مرحوم نے اپنے پیچھے چار بیوائیں، آٹھ صاحبزادے، گیارہ صاحبزادیاں اور پچاس ہزار قرض چھوڑے ہیں۔ خدا سے دعا گو ہوں، کہ خدا ان کی مغفرت کرے اور پس ماندگان اور قرض خواہوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین"۔

محترمہ حور بانو صاحبہ سنبل سے تحریر فرماتی ہیں :

"میری پیشانی چوڑی، کان بڑے، آنکھیں چھوٹی اور رنگ کالا ہے، جن کی وجہ سے میری دل کشی میں کمی آگئی ہے، اس سے نجات دلانے کے لیے بہن کوئی آسان، سستا اور مجرّب نسخہ یا ترکیب لکھیں"۔

(بہنیں اپنی اس مصیبت زدہ بہن کی مصیبت دور کرنے کی طرف رجوع ہو کر دونوں جہاں کا ثواب حاصل کریں —

— (ادارہ)

محترمہ گل خیرہ صاحبہ کو مرغ کا حلوہ، چمرونجی کی دال اور کٹھل کی کھیر بنانے کی ترکیب درکار ہے۔

(محترمہ! آپ اس کے لئے "دسترخوانِ جدید بہ تصویر" کی ایک جلد دفتر سے بذریعہ وی پی منگوا لیں، اس میں آپ کو مطلوبہ ترکیبوں کے علاوہ بہت سے دوسرے نادر و انوکھے پکوان کی ترکیبیں بھی مل جائیں گی —— ادارہ)

محترمہ ناصحہ بیگم صاحبہ کانکے سے تحریر فرماتی ہیں:

"میری جیٹھانی کی خالہ زاد بہن کی نند کی شادی خانہ آبادی جناب منظور حسن صاحب او۔ڈبلیو۔ایل کے صاحبزادے مقبول حسن صاحب ایف۔او۔ایکس سے بروز بدھ بتاریخ ۲۷ اگست ۱۹۷۱ء کی شب کو ہوئی، خدا سے دست بہ دعا ہوں کہ دولھا دلہن کی زندگی ہر شب شبِ برات اور ہر روز روزِ عید کی مثال ہو۔ دولھا تمام عمر دلہن کا غلام رہے اور دلہن کی زندگی ساس نند کے جھگڑوں، بلکہ خود ان کی زندگی سے پاک و صاف رہے۔"

محترمہ عارفہ بیگم جموئی سے لکھتی ہیں:

"میری والدہ عرصہ دس سال سے عارضۂ قلب میں مبتلا ہیں۔ بہنیں کوئی ایسا گھریلو ٹوٹکہ لکھیں کہ وہ اس موذی مرض سے نجات پا جائیں۔"

(بہنیں متوجہ ہوں —— ادارہ)

جوابات

* محترمہ قدرت سبحان بانو کے مصائب کے جواب میں محترمہ فضیلت النساء بیگم سرسی سے تحریر فرماتی ہیں:

"بہن! آپ کے شوہر کی بے راہ روی کو پڑھ کر اور آپ کی مصیبت کو یاد کر کے

میں آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے۔ آپ سرہی کے تکیہ والے شاہ صاحب سے مل کر کوئی تعویذ یا گنڈہ حاصل کیجئے۔ اس کے استعمال سے آپ کے شوہر تمام دنیا کو چھوڑ کر صرف آپ کے ہو کر رہیں گے۔ ساتھ ہی آپ طلسمی کاجل بھی لگایا کریں۔ شوہر پر اس کا اثر جادو کی طرح ہوتا ہے۔

محترمہ ثمینہ صاحبہ نے بال بڑھانے کی ترکیب پوچھی ہے، جس کے جواب میں عالیہ سلطانہ نے یہ چند نسخے ارسال کئے ہیں....

(۱) پاؤ بھر پیاز ایک بوتل سرکہ میں پکا کر پیس لیں۔ ہر روز بالوں کی جڑوں میں اچھی طرح مالش کریں، بال بے تحاشا بڑھ جائیں گے۔

(۲) مینڈک کا سر کڑوے تیل میں پکا کر سر میں لگائیں۔

(۳) شہتوت کی پتی ارہر کی دال میں پیس کر بالوں کو دھوئیں۔ بال خوب بڑھیں گے، کڑوے تیل میں کھٹائی پیس کر ملالیں اور بالوں کی جڑوں میں لگائیں، تو بال سفید نہیں ہوں گے اور خوب بڑھیں گے۔

(۴) بالوں کو بڑھانے کا سب سے آسان نسخہ یہ ہے کہ بازار سے نقلی بال خرید لیں اور اپنے اصلی بالوں میں لگائیں۔ بہت ہی ہمہ گیر نسخہ ہے۔ نقل اصل سے بڑھ جائے گا۔

* ن۔ق صاحبہ نے سالکوٹ سے گذشتہ ماہ قد بڑھانے کی ترکیب پوچھی تھی محترمہ خالدہ صدیقی صاحبہ اس کی ترکیب لکھتی ہوئی فرماتی ہیں۔

"قد بڑھانے کے لئے مقوی غذائیں کافی مددگار ثابت ہوتی ہیں لہٰذا کھانے میں گھی، دودھ (دودھ اگر اونٹنی کا دستیاب ہو جائے تو زیادہ بہتر ہوگا) مکھن وغیرہ زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ اس کے لئے جمناسٹک بے حد ضروری ہے۔ ن۔ق صاحبہ کو چاہیئے کہ چمگادڑ کی طرح اُلٹ لٹکنے کی کوشش کریں، آزمودہ نسخہ ہے قد ضرور

بڑھ جائے گا۔"

* ایک موٹی بہن کے لئے محترمہ کاہیدہ سلطان صاحبہ تحریر فرماتی ہیں:

" بہن! موٹاپا دُور کرنے کا سب سے اچھا علاج نیچروپیتھی ہوتا ہے۔ آپ اسے ضرور آزمایئے۔ علاج ذیل میں درج ہے۔

علاج :

دو یوم خالی ہوا پہ گذارہ کیا جائے۔ یعنی صرف ہوا کھائی جائے۔ تیسرے روز ــــ صرف ترکاریاں ــــ صبح دو اُبلے ہوئے آلو (وزن دس گرام سے زیادہ نہ ہو) دوپہر میں کدو کا سوپ (ایک بڑا چمچہ) شام ایک کافی کی پیالی میں بغیر شکر و دودھ کے ہلکی چائے، بلکہ اگر صرف گرم پانی پیئیں، تو زیادہ مفید ہوگا۔ رات کو پھر اُبلے ہوئے دو آلو (وزن دس گرام) نمک کسی چیز میں نہ ڈالیں ترکاری خود جسم میں نمک مہیا کرے گی...... چوتھے دن بھی یہی غذا رہے گی، ...... پانچویں اور چھٹے دن محض پھلوں کے جوس پر گذارہ کریں ــــ ایک وقت میں جوس ایک بڑے چمچے سے زیادہ نہ پیئیں...... ساتویں دن بھی یہی سب چیزیں چلیں گی۔ صرف دوپہر میں ایک روٹی، انڈے کی زردی کے چوتھائی حصے سے کھائیں۔ (روٹی کا وزن مرغی کے ایک لمبے پر کے وزن سے زیادہ نہ ہو)
...... کبھی کبھی مچھلی اور گوشت بھی ــــ جی چاہے تو کھا سکتی ہیں لیکن وزن دس گرام سے زیادہ نہ ہو۔

احتیاط :

کھانے میں نمک ــــ، شکر، سوڈا، ہر طرح کے مسالے، دودھ، گھی، مکھن، مٹھائی وغیرہ بالکل نہ کھائیں۔ سلاد، پنیر، لیموں، رس والے پھل بالکل نہ کھائیں۔

(آلو، چینی، چاول، روٹی، گوشت، مچھلی اور انڈا
مندرجہ بالا وزن کے مطابق کھا سکتی ہیں۔)
یہ خوراک آپ کم سے کم سال بھر
کھائیے، اگر دُبلی سِینک سلائی
نہ ہو جائیں تو ہمارا ذمّہ ـــــــ"

اگر میں شوہر ہوتی

آپ پوچھیں گے کہ میرے دل میں ایسا خیال کیوں آیا؟ آپ اسے خیال کہہ رہے ہیں؟ جناب یہ تو میری آرزو ہے، ایک دیرینہ تمنّا ہے۔ یہ خواہش تو میرے دل میں اس وقت سے پل رہی ہے، جب میں لڑکے لڑکی کا فرق بھی نہیں جانتی تھی۔ اس آرزو نے اس دن میرے دل میں جنم لیا، جب پہلی بار میرے بھائی کو مجھ پر فوقیت دی گئی، "جب" اور "اب" میں اتنا ہی فرق ہے کہ جب میں یہ سوچا کرتی تھی کاش میں لڑکا (بھائی) ہو جاتی، اور ان سارے سرکش اور فضول سے بھائیوں سے گن گن کر بدلہ لیا کرتی اور ان کی وہ پٹائی کرتی، کہ وہ بھی یاد کرتے، اور اب یہ سوچا کرتی ہوں کاش میں مرد (شوہر) بن جاتی اور میرے "مظلوم اور بے زبان" شوہر میری بیوی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بار جب "وہ" بڑے طمطراق سے بولے "کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں بیوی ہوتا اور تم شوہر" تو میں نے جھٹ یہ جواب دیا۔

"تو بن جائیے نا۔ اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟"

"اچھا تو یہ بتاؤ کہ تم شوہر ہوتیں تو کیا ہوتا؟"

"وہ نہ ہوتا جو آج ہو رہا ہے۔"

"مان لو کہ تم شوہر ہو گئیں۔ اب بتاؤ، تم کیا کرو گی؟"

"تو پھر میں گن گن کر بدلہ لوں گی اور کیا کروں گی، لیکن ذرا مجھے اس بات پر خوش تو ہو لینے دیجیے۔"

اور سچ مچ میرے اوپر تھوڑی دیر تک ایک عجیب سی کیفیت طاری رہی،

اس طرح پرور خیال نے میرے پورے جسم و جان میں ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دی اور میں سوچنے لگی، کہ واقعی اگر میں شوہر بن جاتی تو کیا ہوتا، لیکن اتنا ہی تو کافی نہیں ہوتا کہ میں شوہر بن جاتی، اس کے ساتھ میرے شوہر بھی تو میری بیوی بنتے ـــ مزہ تو جب ہی تھا۔

ذرا تصور کی آنکھ سے دیکھیے ـــ اب میں شوہر بن گئی ہوں۔ مجھے کہیں دعوت میں جانا ہے، میں اپنی تیاری شروع کرتا ہوں۔ شیو بناتا ہوں، نہاتا ہوں گھنٹہ بھر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کریم پوڈر مل کر بڑی مشکل سے اپنے کالے چہرے کو سانولے کی حد تک لے آتا ہوں، پھر ٹائی باندھتا ہوں، ناٹ درست کرنے میں بھی کم و بیش آدھا گھنٹہ لگ ہی جاتا ہے۔ پریس کی ہوئی پینٹ کی کریز درست کرتا ہوں ٹائی کے ہم رنگ نمائشی رومال کو کوٹ کی اوپری جیب میں باقاعدہ جماتا ہوں، وہ گندا رومال جو منہ، ہاتھ، چشمہ اور جوتے پونچھنے کے کام آتا ہے، اسے پینٹ کی جیب میں رکھتا ہوں۔ اپنے فارغ البال ہوتے ہوئے سر پر بچے کھچے بالوں کی تہہ اچھی طرح جماتا ہوں، تاکہ کہیں سے سپاٹ چاند نہ نمودار ہو جائے۔ گھر میں بدقسمتی سے ایک ہی آئینہ ہے اور اس پر کم و بیش ڈھائی تین گھنٹے میرا قبضہ رہتا ہے۔ گھر کے جملہ امور نوکر کو سمجھانے اور دروازے وغیرہ اچھی طرح بند کرنے کی ہدایت دے چکنے کے بعد جب میری بیوی (یعنی میرے موجودہ شوہر) آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر میک اپ شروع کرتی، تو میں ٹھیک اپنے موجودہ شوہر کی طرح کہتا ہوں "بس اب تیار ہو بھی چکو، تمہاری وجہ سے پارٹی میں دیر ہو گی۔ خدا بچائے عورتوں کے سنگار اور آرائش سے۔"

میرے بار بار کہنے پر، کہ دیر ہو رہی ہے، جلدی کرو، وہ غریب پندرہ منٹ میں الٹی سیدھی تیار ہو جاتی ہے اور جلدی میں ایک نئی اور ایک پرانی چپل

پہن کر، یا ساڑی سے میچ کرتا ہوا پرس میز ہی پہ چھوڑ کر پرانا پھٹا ہوا پرس ہاتھ
میں لٹکائے چل پڑتی ہے، اور میں اس کی سابقہ شوہرانہ زیادتیوں کو یاد کر کے
دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوا اس کے ساتھ ہو لیتا ہوں۔ جب ہم دعوت میں
پہنچتے ہیں تو تقریباً لوگ واپس جا رہے ہوتے ہیں۔ لیکن میں بڑی آسانی سے یہ کہہ
کر صاف بچ جاتا ہوں۔

"معاف کیجئے گا، ان کی تیاریوں میں دیر ہو گئی۔ عورتوں کا میک اپ
تو آپ جانتے ہی ہیں۔"

پھر بھلا کس میں ہمت ہے کہ اس عالمگیر جھوٹ (جسے حقیقت کہا جاتا ہے)
سے انکار کر دے۔

شوہر بننے کے ایک اور افادی پہلو پہ بھی ذرا غور کر لیں۔ مجھے کہیں صبح سویرے ہی
جانا ہے، دسمبر کی کڑکڑاتی سردی ہے۔ میں گھڑی میں چار بجے کا الارم لگا کر سو جاتا ہوں،
میری بیوی الارم کی کرخت اور مسلسل آواز سے گھبرا کر اٹھ بیٹھتی ہے اور باورچی خانہ میں
جا کر ناشتے کی تیاری میں جٹ جاتی ہے۔ اتنے سویرے نوکر کو اٹھانے کی کس میں ہمت ہے
آپ ہی بتلایئے، جب شوہر نہیں اٹھتا، تو نوکر کیا اٹھے گا۔ باورچی خانے میں کھٹ پٹ کی
آواز ہوتی رہتی ہے، اور میں لحاف میں دبکا پڑا رہتا ہوں۔ گرما گرم پراٹھوں، انڈوں،
حلوے وغیرہ کی اشتہا انگیز خوشبو بھی مجھے بستر سے اٹھانے میں ناکام رہتی ہے تو پھر
میری بیوی آتی ہے، ہولے ہولے مجھے اٹھاتی ہے، اور پھر جب میں گرم پانی سے شیو کرنے
اور نہانے کے بعد تیار ہو کر میز پہ پہنچتا ہوں تو ناشتہ کی بیشتر چیزیں اور چائے ٹھنڈی
ہو چکی ہوتی ہے، اور ان چیزوں کے دوبارہ گرم ہونے میں جو وقت لگتا اسے اپنے لیٹ
ہونے کا ذمہ دار قرار دے کر بکتا جھکتا میں گھر سے روانہ ہو جاتا ہوں۔

اگر میں شوہر ہوتی، تو اس وقت کتنا مزا آتا جب دفتر سے ٹھیک ٹائم سے

واپسی پر دفتر کے کینٹین یا کسی دوسرے ریستوران میں دوستوں کے ساتھ چائے ناشتہ کرتے ہوئے خوش گپیاں کرنے کے بعد مُنہ سُکھائے ہوئے دفتر کے کام سے تھک جانے اور اپنے باس کی زیادتیوں کی شکایت لئے ہوئے گھر میں داخل ہوتا اور بے دم ہوکر مسہری پر گر پڑتا۔ بیوی بے چاری لپک کر جوتے اتارتی، پنکھا آن کرتی اور تکیئے وغیرہ ٹھیک سے رکھ دیتی اور تھوڑی دیر کے لئے میرے آرام وسکون کی خاطر گھر کے تمام ہنگاموں کو روک دیا جاتا اور میں بیوی کی طرف سے کروٹ لئے دل ہی دل میں ہنسا کرتا۔

اور اس سے بڑھ کر مزا تو اس وقت آتا، جب دفتر سے نکلتے ہی یار لوگ کسی ادبی یا غیرادبی پروگرام کے لئے باہر ہی باہر مجھے گھسیٹ لیتے اور ساڑھے پانچ بجے کی بجائے دس یا رہ بجے رات کو تھکا ماندہ گھر پہنچتا اور بیوی کی عقلمندی اور تیزی وطراری کے باوجود اسے یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جاتا، کہ اسٹاف کی کمی کی وجہ سے آج میری ڈبل ڈیوٹی لگا دی گئی تھی۔ میری بیوی دفتر کی بدانتظامیوں کو بُرا بھلا کہتی ہوئی کھانا گرم کرنے چل پڑتی۔ باورچی خانے سے اس کی بڑبڑانے کی آواز آتی رہتی اور میں دل کھول کر خوش ہوتا اور مزے لیتا۔

ایک اور پُر لطف بات یہ ہوتی، کہ میرے لئے پڑھنے لکھنے کا سامان اور سکون ہر وقت موجود ہوتا اور فرصت کے اوقات میں میں بڑی آسانی سے لکھ پڑھ لیتا، میری زیادہ مصروفیت دیکھ کر میری بیوی گرم گرم چائے کی پیالی میز پر رکھ جاتی یہی نہیں، بلکہ ایسے وقت میں ہر آنے والے کو "صاحب گھر میں نہیں ہیں" کا پیغام پہنچا دیا جاتا۔

اس وقت تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ ہوتا جب میں دیکھتا کہ میری بیوی اب کچھ لکھنے کو بیٹھی ہے۔ ابھی اسے کاغذ قلم لے کر بیٹھے ہوئے کچھ دیر بھی نہ ہوئی ہوتی کہ ملازم آدھمکتا۔

"بی بی جی، سودا لایا ہوں، حساب ملا لیجیے۔" تھوڑی دیر بعد ہانک لگاتا،
"بی بی جی گوشت کیسا پکے گا، شوربے دار یا بُھنا ہوا۔" پھر ایک آواز آتی "بی بی جی!
کپڑے لائی ہوں، ملا لیجیے۔" اور میری بیوی بھناتے ہوئے کاغذ قلم پٹک کر دھوبن
کا حساب کتاب کرنے اور پھر میلے کپڑے لکھنے کو چل پڑتی، اور جب اس سے کوئی
پوچھتا کہ آپ کے لکھنے پڑھنے کو کیا ہوا تو جل کر جواب دیتی "چولھے بھاڑ میں گیا۔"

پہلی تاریخ کو ایک فرماں بردار شوہر کی مثال قائم کرتے ہوئے تنخواہ
بیوی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے تمام آسمانی اور زمینی آفتوں سے بری الذمہ ہو جاتا بے فکری
کے دن اور رات کٹتے، کبھی سوچنے کی ضرورت نہ پڑتی کہ گھر کیسے چل رہا ہے۔ مقررہ
جیب خرچ کے علاوہ بیوی کی صندوقچی پر بھی چھوٹے موٹے ڈاکے ڈالا کرتا اور اس کے
پوچھنے پر اچھی خاصی جنگ کا ماحول پیدا کر دیتا۔ مجھے کبھی یہ پتہ نہ چلتا، کہ کب عید آئی
اور کیسے بقر عید منائی گئی۔ ایک قربانی کے لئے بیوی نے کتنی قربانیاں دیں۔ دوسروں
کے یہاں کی تقریبات نے اپنے گھر گرہستی کی دُنیا میں کتنا بڑا زلزلہ پیدا کیا اور تنخواہ کی
بنیادیں تک ہلیں۔ میں تو بس ٹھاٹ سے ان تقریبات میں حصّہ لیا کرتا دوستوں
اور عزیزوں سے ملاقاتیں ہوتیں، مزے دار کھانے ملتے اور خوب تفریح رہتی۔ اگر میری بیوی
کبھی میری فضول خرچی سے تنگ آکر بجٹ فیل ہونے کی بات کہتی، تو میں بڑے پیار
سے کہتا "جانِ من! بجٹ فیل تو ہر بڑی حکومت کا رہتا ہے، بجٹ کا فیل ہونا باعثِ
فکر نہیں، بلکہ باعثِ عزت و شوکت ہے۔"

تو جناب یہ ہے میرا پروگرام، بس خدا ایک بار مجھے شوہر بنا دے، تاکہ میں بھی
فخر سے کہہ سکوں ؎

زندگی نام ہے ہنس ہنس کے جئے جانے کا

★★

شوہر ہونے کے بعد

ایک صبح میری آنکھ کھُلی، تو میں نے دیکھا کہ میں ایک شوہر ہو چکی ہوں۔ یہ معجزہ کیسے ظہور پذیر ہوا، اس کے لئے میں خود حیران ہوں، بس اتنا یاد ہے کہ ایک بار میں نے شوہر بننے کی خواہش ٹوٹ کر کی تھی۔ قدرت نے غالباً میری پچھلی تمام خواہشوں کی پامالی کے صلہ میں اتنی بڑی اور ناممکن سی خواہش راتوں رات پوری کر دی۔

قصہ مختصر یہ کہ اب میں ایک عدد شوہر ہوں، اس بیوی کا شوہر، جو کبھی میرے شوہر رہ چکے تھے۔ میں کیا بتاؤں کہ شوہر بننے کے بعد چند ماہ کیسے آرام و سکھ کے گذرے ہر وقت ایک مستی و سرشاری کی کیفیت میرے اوپر چھائی رہتی، ایک جذبۂ افتخار سر پر سوار رہتا۔ گویا کہ شوہر ہو جانا کسی ملک کے صدر یا بادشاہ بن جانے سے کم نہیں — لیکن میں ابھی اپنے اس اعزاز پر دل بھر کے خوش بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اس کے سنگین اور تلخ نتائج سامنے آنے لگے۔ اب تو ایسا لگ رہا ہے کہ گھر اور دفتر چکی کے دو پاٹ ہیں اور میں ان میں مسلسل ایسا پس رہا ہوں، کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن —

شوہر بننے کے بعد شوہرانہ ذمہ داریوں پر جیسے جیسے میرے تجربات وسیع ہوتے جا رہے ہیں، میرے چھکے چھوٹتے جا رہے ہیں۔

میں سوچتا ہوں، ہم مردوں پر قدرت نے یہ داڑھی مونچھ کچھ بے فیض کھیتی ایک عذاب کی شکل میں نازل کر دی ہے۔ صبح ہی صبح اور کبھی کبھی شام کو بھی اس کھیتی کو کاٹنے اور دوسرے ہی دن پھر اس کی فصل تیار ہو جانے پر جو کوفت ہوتی ہے، وہ

ناقابلِ بیان ہے، یقین جانیں جب میں اپنی بیوی کو دس منٹ میں جھٹ پٹ
تیار ہوجاتے دیکھتا ہوں تو ان کی قسمت اور اپنی گذشتہ زندگی پر رشک کیے بغیر
نہیں رہ سکتا، یہاں ایک مصیبت ہو تو بیان کی جائے۔ کبھی ٹائی کی ناٹ درست
کرنے میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں، کبھی جوتے اور چہرے کو چمکانے میں ہاتھ اور چہرے کو
جا بجا داغدار کرنا پڑتا ہے۔ جاڑے کے دنوں میں صبح ہی صبح لحاف سے نکل کر شیو
بنانے، منہ ہاتھ دھونے اور لباس تبدیل کرنے سے ناشتہ تک کے مراحل سے گذرنے
کے بعد جب گھڑی پر نظر ڈالتے ہیں تو پونے نو ہوتے ہیں۔

اُف! دفتر نو بجے پہنچ جانا چاہیئے۔ خیر، گھر سے دفتر کا راستہ دس منٹ
کا ہے، لپک کر جائیں تو سات منٹ میں پہنچ سکتے ہیں۔ چنانچہ لپکتا ہوا دفتر کے لئے
روانہ ہوتا ہوں، گلی کے نکڑ پر جھٹ پٹ صاحب یوں کھڑے ملتے ہیں گویا میرے ہی
انتظار میں کھڑے تھے۔

"اخاہ! آپ خوب مل گئے۔ میں آپ ہی کی طرف جا رہا تھا ــــ دراصل
رات ایک تازہ غزل ہوگئی ــــ ہا ہا! ــــ کیا غضب کا مطلع بندھ گیا.....
سماعت فرمایئے۔"

وہ طوفان میل کی طرح رواں ہوجاتے ہیں لیکن میں بیچ ہی میں خطرے کی
زنجیر کھینچتے ہوئے انھیں واپس گلی کی پرشور دنیا میں لاتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ میں
بہت جلدی میں ہوں، ہمارے نئے باس سخت اصولوں کے مالک ہیں۔ کئی دنوں سے لیٹ
ہو رہا ہوں، مجھے وقت پر دفتر پہنچنا ہے۔"

"اماں چھوڑو بھی! بہت دیکھے ہیں ایسے باس واس ــــ ایسی غزل
پھر نہ سن سکو گے۔"

لیکن انھیں غزل پڑھتا ہوا چھوڑ کر تقریباً دوڑتا ہوا دفتر کی راہ لیتا

ہوں، پھر بھی دس منٹ لیٹ تو ہو ہی گیا، ڈانٹ سننا یقینی تھا کیں بیوی سے عین وقت پر بٹن ٹانکنے کے لئے جو جھک جھک ہو گئی تھی، اس کے نتیجے کے طور پر بغیر بٹن کے کھلی ہوئی آستین کے ساتھ میں پندرہ منٹ لیٹ دفتر پہنچا تھا۔ دفتر پہنچتے ہی چپراسی طلبی کا حکم لئے میز کے پاس آدھمکا۔ پھر باس کی زہریلی نگاہوں کے ساتھ ڈانٹ کی ایک خوراک بھی پینی پڑی۔ ایسے موقعوں پر مجھے اپنے پہلے والے باس یاد آجاتے ہیں۔ آہاہا! کیا پیاری شخصیت تھی۔ کبھی بھول کر ہمارے دیر سے آنے کا نوٹس نہیں لیا۔ کیا خوب افسر تھے جناب! کیا مجال کبھی بارہ بجے سے پہلے دفتر آئے ہوں۔ ایک گھنٹہ لیٹ جایئے، دو گھنٹہ لیٹ جایئے، کوئی پرواہ نہیں، ہاں اتنا خیال ضرور رکھنا پڑتا تھا، کہ کبھی بارہ بجے کے بعد نہیں جایا کرتے تھے، یار لوگ خوب مزے کرتے تھے۔ یہ "مسٹر گھڑی" جب سے آئے ہیں، اپنی مصیبت آگئی ہے۔ یہ تو عالم ہے دفتر کی حاضری کا ـــــ لیکن گھر کی حاضری کا حال نہ پوچھیئے۔ پوری ڈکٹیٹر شپ ہے، پانچ بجنے کے بعد اگر ایک منٹ کی بھی دیر ہو گئی گھر پہنچنے میں تو بس سمجھ لیجئے کہ قیامت آگئی۔ اس دفتر اور بیوی کی رسّہ کشی نے جان عذاب میں ڈال رکھی ہے، یعنی کہ اگر بیوی کو خوش کرنے کے لئے دفتر دیر سے جاؤں اور جلدی گھر بھاگوں تو صاحب ناراض ہوتے ہیں، اگر صاحب کو خوش کرنے کے لئے وقت پر دفتر پہنچے اور دیر تک کام کے لئے رُکیے، تو بیوی چرخ ہوتی ہیں۔

ایک دوسری رسّہ کشی میری محترمہ اور میرے دوستوں کے درمیان چلتی ہے۔ محترمہ چاہتی ہیں، میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت گھر پر گذاروں ـــ احباب چاہتے ہیں، وقت کا زیادہ حصّہ ان کے ساتھ گذاروں، شاعر حضرات چاہتے ہیں کہ میں ان پر نازل ہونے والے نوع بہ نوع کلام کو سُن کر زیادہ سے زیادہ واہ واہ کروں یہی نہیں، بلکہ اگر ہو سکے تو ان کے پورے دیوان ایک ہی نشست میں کئی بار سُن لوں۔

ادیب اور افسانہ نگار حضرات کی خواہش ہوتی ہے کہ میں ان کے پورا افسانے اور اور طویل ناول صبر کے ساتھ سُنوں اور نہ صرف سُنوں بلکہ ان پر تنقید بھی کروں اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تنقید و تبصرہ سے مراد محض تعریف و توصیف ہوتی ہے۔

میرے ایک بے تکلّف دوست تو ایسے ہیں، جو ناول سے کم کوئی چیز تصنیف نہیں کرتے اور اس ناچیز پر اس قدر مہربان ہیں، کہ اپنی ہر نئی تصنیف کا مسوّدہ مجھے سُنائے بغیر پبلشر کو نہیں دیتے، چاہے اس کے لئے دو دن اور دو راتیں ایک ہی جگہ پر بیٹھے ہوئے گذر جائیں۔

اس لالچ میں کبھی تو مجھے کسی مشاعرہ کا صدر بنا دیا جاتا ہے، کبھی کسی ادبی تقریب کا کنوینر اور کبھی بزم باادب جیسی شئے کا جنرل سکریٹری، اور میں مثلث کے ان تین زاویوں یعنی دفتر، گھر (دوسرے الفاظ میں بیوی) اور احباب) کے چکّروں میں ایسا پھنسا ہوا ہوں کہ بالکل گھن چکّر ہو کر رہ گیا ہوں۔

میرا المیہ یہ ہے کہ کسی زمانہ میں مَیں بیوی، اور میری موجودہ بیوی شوہر رہ چکے ہیں، اس لئے ہم دونوں "بیویانہ" اور "شوہرانہ" داؤں پیچ سے اچھی طرح واقف ہیں، اس لئے ایک دوسرے پر چل نہیں پاتی۔ اگر کبھی سچ مچ بھی اوور ٹائم کر کے گھر میں داخل ہوتا ہوں، تو میرے لاکھ لاکھ قسمیں کھانے پر بھی میری بیوی کو یقین نہیں آتا اور اسے میری بہانہ بازی سمجھتے ہوئے مہابھارت کا نقشہ کھینچ دیتی ہیں، گھر میں اس قدر واویلا مچتی ہے کہ صبح سے محلہ والوں اور پُرسشِ احوال کرنے والوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ بیوی کے بعد ان کو اپنے دیر سے آنے کی وجہ بتلاتے اور صفائی دیتے دیتے بھی جی چاہنے لگتا ہے، کہ میں خود صاف ہو جاؤں۔ یہی نہیں میری شریمتی جی گذشتہ زندگی کے واقعات کی جوابی کارروائی کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتی ہیں، ایک بار محض اس بات کے لئے کہ میں نے ان کی پسندیدہ مونچھیں شیو کرنے کے

اناڑی پن کی وجہ سے مونڈ ڈالی تھیں، وہ ایک سال کے لئے میکے جا براجی تھیں۔

اس پر مجھے یاد آیا کہ اپنے بیوی ہونے کے زمانے میں، میں بھی ایک بار محض اس بات سے ناخوش ہوکر کہ میری پسندیدہ اور بازار سے لائی ہوئی ٹائی میرے شوہر نے ایک خاص موقع پر نہیں باندھی تھی، سال بھر تک اپنے میکہ میں ڈٹی رہی۔

یہی نہیں، وہ اکثر اپنی فطری شہ زوری اور میری فطری کمزوری کی وجہ سے مجھ پر غالب آجاتی ہیں، کیونکہ ہزار کچھ ہو، ان میں صنفِ کرخت اور مجھ میں صنفِ لطیف کی کچھ نہ کچھ خو بو تو باقی ہے ہی، اس لئے اکثر لڑائیاں وہ جیت جاتی ہیں ــــ ایک بار ایسی ہی ایک خانہ جنگی میں انھوں نے پاس پڑی ہوئی ایک کرسی میرے سر پر دے ماری۔ نشانہ چوک گیا اور کرسی کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔

میں چیخا " تم نے میرے کرسی کیوں ماری؟ کرسی ٹوٹ گئی۔"

بولیں " میرا ایسا ارادہ نہ تھا "

" کیسا ارادہ؟ مجھے مارنے کا؟ "

بولیں " نہیں، کرسی توڑنے کا! "

دوسرے دن میں نے سُنا، ہماری پڑوسن اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان سے پوچھ رہی تھیں۔

" تم نے اپنے شوہر کو کرسی کیوں دے ماری؟ "

وہ بڑی معصومیت سے بولیں۔

" کیا کرتی۔ میز مجھ سے اٹھ ہی نہیں رہی تھی "

جس بجٹ کے لئے محترمہ اپنی گذشتہ زندگی میں یعنی ایامِ شوہری میں ہمیشہ کہا کرتیں،

" جانِ من بجٹ کا فیل ہونا باعثِ زحمت نہیں بلکہ باعثِ عزت و فخر ہے

کیوں کہ بجٹ ہر بڑی حکومت، بڑی فرم اور بڑی شخصیت کا فیل ہوا کرتا ہے " اب اسی بجٹ کے ٹائٹ رہنے کے سبب مہینہ کی پندرہ تاریخ ہی سے ان کی لڑائی شروع ہو جاتی ہے ـــ پیسے خرچ کرنے میں ہم دونوں یکساں واقع ہوئے ہیں۔ کسی کو بھی قابلِ رحم حالت میں دیکھ کر ہم دونوں ہی متاثر ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے چھپا کر اس کی مدد شروع کر دیتے ہیں، لیکن میرے ہاتھ پیر تو واقعی اس وقت پھول جاتے ہیں۔ جب مہینہ کے تیسرے ہفتے کے آغاز ہی میں بیوی اس بات کا اعلان کر دیتی ہیں کہ تنخواہ کے سارے روپے ختم ہو گئے۔ اب اگر بدقسمتی سے میرے منہ سے نکل گیا۔

"ارے، پانچ سو روپے اتنی جلدی ختم ہو گئے؟" تو بس سن لیجئے ایک لمبی چوڑی تقریر۔

"لو اور سنو! اب مجھ سے حساب بھی لیا جانے لگا۔ ارے یہ میرا ہی دم ہے جو اتنا بڑا جنجال سنبھالے ہوئے ہوں۔ ہزاروں تو خرچے ہیں، سینکڑوں طرح کے بلوں، فیسوں اور چندوں نے زندگی کو اجیرن بنا رکھا ہے۔ مہمانوں اور بیماری نے الگ ناطقہ بند کر رکھا ہے، اس پر تمہاری فضول خرچیاں غضب ہیں۔ لاکھ بار کہا فضول خرچیاں کم کیجئے، پان سگریٹ کی عادت چھوڑیئے، دوستوں کو چائے پان کھلانا ترک کیجئے۔ مگر آپ مانتے کب ہیں؟ قسم لے لو جو میری ذات پر ایک کچا پیسہ بھی خرچ ہوتا ہو، میرا کیا ہے، جیسا کہیں گے ویسا خرچ کروں گی ـــ جہاں کہئے کٹوتی کر دوں؟

بار بار کی لڑائی جھگڑے سے تنگ آ کر کہ کون زیادہ خرچ کرتا ہے، میں نے بیوی کو ایک کاپی دی، کہ جو کچھ خرچ کیا کرو اس میں درج کر لیا کرو، تاکہ آئندہ سوچ بچار کر بجٹ بنایا جائے۔ محترمہ نے خوشی خوشی نوٹ بک لے لی اور مہینہ کی پندرہ تاریخ کو ہی کاپی واپس کر دی۔

پہلے صفحہ پر لکھا تھا:

آمد ۵۰۰/۰۰

خرچ ۵۰۰/۰۰

اللہ اللہ خیر صلاّ

چلو چھٹی ہوئی۔

جب تک میری حیثیت اس گھر میں ایک بیوی کی سی رہی، میں یہی سمجھتا رہا کہ گھر کے کارخانہ کی چابی شوہر کے ہاتھ میں ہوتی ہے، لیکن اب یہ تجربہ ہو رہا ہے کہ جو کچھ ہے، بیوی ہے، بیوی کے خلاف مرضی پتّہ تک نہیں ہل سکتا ـــــ اور جس کو "نصف بہتر" کہا گیا ہے، وہ کل "بدتر" سے کسی صورت بھی کم نہیں ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ میرے دوستوں کی چائے پان پر تو ان کی کڑی نظر رہتی ہے ـــــ لیکن ان کی دوستوں پر اور ان پر کیا خرچ ہوتا ہے، یہ بھی سُن لیجیے۔

ایک بار مہینہ کے آخری ہفتہ میں جب اپنی بیگم سے سگریٹ کے پیسے مانگے تو چیخ کے بولیں۔

"میرے پاس اب پچیس روپے سے زیادہ نہیں رہ گئے ہیں، ۳۱ تاریخ تک اسی میں گھر چلانا ہے، آپ کے فضول سے دوستوں کو چائے سگریٹ کے لئے میرے پاس مفت کے پیسے نہیں ہیں۔"

"ارے پرسوں ہی تو ریڈیو اسٹیشن سے ملے ہوئے پچھتّر روپے لاکر تمھیں دیئے تھے، وہ کیا ہوئے۔"

"کیا آپ کو معلوم نہیں، کہ کل "انجمن اصلاح نسواں" کا جلسہ ہمارے یہاں تھا، پینتالیس روپے تو اسی میں خرچ ہو گئے۔"

"پینتالیس روپے! ایک میٹنگ میں پینتالیس روپے خرچ ہو گئے؟"

میں آنکھیں پھاڑ کر بولا اور ان پھٹی ہوئی آنکھوں کے سامنے میرے غریبا مو ادبی

جلسے ناچنے لگے، جس میں ٹھیک سے چائے پان کا انتظام بھی نہیں ہو پاتا۔

"تو اور کیا، اتنے بڑے بڑے گھر کی خواتین آئی تھیں، وہ کیا بغیر کھائے پئے چلی جاتیں۔ پچیس روپے میں تو ایک درجن چائے کے مگ لائی تھی، اور بیس روپے میں چائے پانی پان وغیرہ ہوا۔"

"کیا گھر میں پیالیاں نہیں تھیں، جو تم نئی پیالیاں لے آئیں؟"

"اُفّوہ! نہ جانے کب آپ کو سمجھ آئے گی، اتنی معزز خواتین کے سامنے وہ باوا آدم کے زمانے کی جاپانی سڑی بسی پیالیاں رکھ دیتی، تو کیا ہماری ناک نہ کٹ جاتی، آپ کو نہ زمانے کی خبر، نہ فیشن کی، آج کل تو چائے کے مگ ہی استعمال کرنے کا فیشن ہے۔"

خیر صاحب یہ ایک دن کی بات ہوتی، تو ایک بات بھی تھی، یہاں تو کبھی فرمائش ہوتی ہے۔

"آج مجھے انجمن کے جلسے میں جانا ہے، میرے پاس کوئی اچھی چپّل نہیں ہے اللہ مجھے ویسی ہی ہائی ہیل کی چپل دلا دیجئے نا جیسی بیگم ارمان کے پاس ہے۔"

کبھی یہ کہ ——

"پرسوں مجھے اپنے نزہت کلا اسکول کے افتتاح کے لئے وقت لینے کے واسطے ریاست کی خاتون وزیر کے پاس جانا ہے، میں کیا پہن کر جاؤں۔ آپ کو معلوم ہے وہ کیسی کیسی ساڑھیاں پہن کر پبلک تقریبوں میں آتی ہیں۔ ڈارلنگ وہ جاپانی جارجٹ کی پرنٹیڈ ساڑھی جو ہم نے مفت لال کے شوکیس میں دیکھی تھی، وہ دلا دو۔"

کبھی دیکھ رہے ہیں، تو بک شیلف خالی پڑا ہے، پوچھنے پر معلوم ہوا کتابیں "انجمن اصلاح نسواں" کی لائبریری کو دان کر دی گئیں، اب کوئی پوچھے، بک شیلف کیوں چھوڑا، اسے بھی بھجوا دو۔ کبھی گھر کی چوکیداری کرنی پڑتی ہے کہ بیگم صاحبہ انجمن کی

ہنگامی میٹنگ میں اچانک چلی گئی ہیں ۔۔ کبھی بچوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے کہ ان کی والدہ محترمہ انجمن کی طرف سے پیش ہونے والے کلچرل پروگرام کی تیاری میں بے حد مصروف ہیں، کبھی معلوم ہوا کہ گھر کی دریاں، قالین اور فرنیچر انجمن کو عاریتاً کسی پروگرام میں کام آنے کے لئے دیئے جا رہے ہیں، کبھی موٹی سی رسید بک ہمیں پکڑا دی جاتی ہے۔

" اللہ سیلاب زدگان کے ریلیف فنڈ کے لئے چندہ جمع کرا دیجئے۔"

تو صاحب اس انجمنِ اصلاحِ نسواں نے سب سے پہلے ہمارے گھر کو تاکا، اور میری "کُل بدتر" کا اچھی طرح بیڑا غرق کیا۔

میری بیوی کو ہمیشہ اپنی ناک، اور میری عزت کا بڑا خیال رہتا ہے ۔۔ اپنی عزت کا تو مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ شہر میں کتنی ہے، لیکن ان کی ناک کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ "نہیں" کے برابر ہے، کیونکہ جتنا اسے بچانے کی کوشش کی جاتی ہے، اتنی ہی زیادہ وہ کٹتی جا رہی ہے، پھر بھی میری بیوی اس متعدد بار کی کٹی ہوئی ناک کو کٹنے سے بچانے کے لئے میری جھکی ہوئی کمر کو اور جھکا کر میرے قد کو مزید چھوٹا کرنے پر تلی رہتی ہیں۔ خاندان اور دوستوں کے یہاں ہونے والی آئے دن کی تقریبات اکثر دن میں تارے دکھا دیتی ہیں، کبھی کبھی تو معاملہ بڑا سنگین ہو جاتا ہے۔

ایک دن دفتر سے جو آیا، تو دیکھا ہماری بیگم بڑی دل گرفتہ بیٹھی ہیں اگرچہ یہ خاموشی پیش خیمہ تھی کسی ہنگامہ خیز دھماکے کی، پھر بھی پرسشِ احوال تو ضروری تھا۔

پوچھنے پر پتہ چلا ۔۔۔ "باجی کی ساتویں لڑکی کا عقیقہ ہے، اس میں شرکت کا دعوت نامہ آیا ہے۔"

" اوہو، یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، عقیقہ کی دعوتیں بڑی شاندار ہوتی

ہیں، خصوصاً اس مہنگائی کے دور میں ـــــ ضرور چلیں گے اور خوب ڈٹ کر کھائیں گے۔"

"آپ کا کیا ہے، جائیں نہ سمجھیں! خوش ہو گئے، بچی کا عقیقہ ہے ایسے ہی چلے جائیں گے ـــــ کم از کم بچی کے لئے پانچ جوڑے اور کچھ کھلونے تو جائیں گے۔ سَو روپے سے کیا کم لگیں گے، پھر باجی کو ارمان ہو گا میکہ کا بھی، جوڑا نہیں تو ایک دوپٹہ اور چوڑیاں تو بھیجنی ہی پڑیں گی، اگر بھائی صاحب کو کچھ نہیں دیا، تو وہ کیا سوچیں گے۔ ہمارے تو بہنوئی ہیں۔ کم از کم ایک ٹائی، ٹائی پن اور رومالوں کا سیٹ تو ہونا چاہیے۔ دو سو سے کم کا خرچ نہیں۔"

جی میں آیا کہوں، بھائی صاحب کے لئے تو نہیں، اگر میرے لئے ایک مضبوط سی ٹائی خرید دو تو بڑی عنایت ہوگی، کم از کم پھانسی کے پھندے کا کام تو دے ہی دے گی، لیکن بناوٹی ہنسی کے ساتھ بولا۔

"واہ بھئی واہ! حد ہو گئی تم لوگوں کی جہالت اور دقیانوسی پن کی ـــ اوّل تو یہ رسمیں ہی فرسودہ ہیں، اگر منانا ہی ہے تو نئے طریقے رائج کرو ـــ تم تو اصلاح نسواں کی حامی ہو۔ تم نے پھول ہار کی بات کی تھی، بس ٹھیک ہے۔ بچوں کے لئے مٹھائی، اور پھول ہار باجی اور بھائی صاحب کے لئے۔"

"واہ واہ! کیا بات کہی ہے، ایک میرے اصلاح کرنے سے تو اصلاح ہونے سے رہی۔ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ میں خوب جانتی ہوں۔ آپ یہی چاہتے ہیں سسرال میں میری ناک کٹ جائے۔ دیکھ لیجئے گا۔ بھابی، بچّی کے علاوہ ماں باپ کے بھی بھاری جوڑے لائیں گی۔ ہماری غریبی تو ہماری عزّت کا جنازہ نکالنے پر تلی ہوئی ہے۔"

وہ قریب قریب روتے ہوئے بولیں۔

"اے رے! یہ کیا ہونے لگا" ہر شریف مرد کی طرح اب میں بھی بیوی کے آنسوؤں سے ڈرنے لگا تھا۔ کیا پتہ یہ سیلاب کی صورت نہ اختیار کر لیں "بس بھئی بس! اب رونا دھونا بند کرو۔ میں دفتر سے دو سو روپے ایڈوانس لے لوں گا"

"دو سو روپے میں کیا ہو گا؟ کیا میں ننگی بُچی جاؤں گی۔ عورتیں تو ایسے موقعوں پر زیور تک بنوا لیتی ہیں۔ میرے پاس تو موئے وہی شادی کے گھسے گھسائے زیورات ہیں، خیر زیور نہ سہی، جوڑا تو ایک ڈھنگ کا ہونا چاہیئے؟ بچّے بھی پُرانے دھرانے کپڑے پہن کر جائیں گے؟"

بہر حال سب کے کپڑوں، جوڑوں اور تحفے وغیرہ کا جو بجٹ بیوی نے بنایا وہ بقول ان کے بہت ہی کفایت اور کاٹ چھانٹ کر ۵۰۰ روپے کا نسخہ تھا، اس طرح ہماری شریمتی جی نے، جو انجمن اصلاح نسواں کی ایک سرگرم رکن ہیں، پانچسو روپے ایک عقیقہ پر خرچ کر دیئے اور یہ غریب شوہر آج تک اس مضبوط ٹائی کے خریدنے کی حسرت دل ہی میں لئے بیٹھا ہے۔

آپ سمجھتے ہوں گے، کہ میری مصیبتیں تمام ہو چکیں، لیکن جناب وہ مصیبتیں ہی کیا جو تمام ہو جائیں، میری بیوی کو عام شکایت یہ رہتی ہے کہ میں گھر کا کام نہیں کرتا۔ بقول ان کے "ایک جان ہزار مصیبتیں" لیکن کاش کہ کوئی روزمرہ کے کاموں کے لئے لائن میں لگنے والی اس لمبی لائن کو بھی دیکھتا ___ مثلاً بجلی کا بل جمع کرنا ہو تو لائن میں لگیئے منی آرڈر کرنا ہو تو لائن میں لگئے، سیٹ ریزرو کرانی ہو تو لائن میں لگیئے۔ ٹکٹ ڈاک کا لینا ہو کہ سنیما کا، ریلوے کا لینا ہو یا بس کا، لمبی لائن میں لگنا ہی پڑتا ہے۔ کنٹرول کی دکان سے راشن لانے کے لئے ڈھائی تین سو لوگوں کی لمبی لائن میں لگ کر نہ صرف کپڑے پھڑوایئے، جیبیں کٹوایئے، بلکہ وہاں ہونے والی تمام چھیچم دھاڑ اور گالی گلوج کو شہد کے گھونٹ کی طرح پیجیئے۔ یہی نہیں، بلکہ وہاں ہونے والے جھگڑے فساد کے

نتیجہ میں جو مقدمات چلتے ہیں، اس کے عینی گواہ بن کر عدالت کے گھن چکر بنیئے ہماری بیگم جو کاموں کی لمبی لائن لگا کر ہمیں دکھاتی ہیں، ان لائنوں میں کھڑے ہونے کے نام سے کوسوں دور بھاگتی ہیں اور یہ کہہ کر اپنی جان بچا لیتی ہیں۔

"اے نوج! کہیں شریف گھر کی بہو بیٹیاں بھی لائنوں میں لگا کرتی ہیں؟"

غرض ان روز روز کی مصیبتوں اور جھگڑوں سے میں تنگ آ گیا ہوں۔ بیوی سے خوب جم کر لڑائی ہوئی، لیکن صورتِ حال یہ تھی کہ نہ ہم بدلے، نہ وہ بدلیں۔ آخر جان سے عاجز آ کر میں گھر میں مسلم پرسنل لا کی کتاب لایا، اسے بغور پڑھا اور شرعی جواز ڈھونڈا، کہ اگر بیوی شوہر کو تنگ کرتی ہو تو دوسری شادی کی کس حد تک گنجائش نکل سکتی ہے اور ایک دن لڑائی کے دوران جب وہ میکے جانے کی دھمکی دے رہی تھیں، میں نے اپنی بیوی کو دھمکی دے دی، کہ میں دوسری شادی کرنے جا رہا ہوں —— پھر کیا تھا، اللہ دے اور بندہ لے —— بیوی کی لڑائی نے ایسا زور باندھا کہ میں جان سے بیزار ہو گیا، اور چیخ کر بولا ——

"چپ ہو جاؤ، ورنہ میں دیوار سے سر ٹکرا دوں گا!"

وہ بھلا کاہے کو چپ ہونے لگیں اور میں نے سچ مچ دیوار سے سر دے مارا۔
ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ پلنگ کی پٹی پر میں نے اپنا سر دے مارا تھا، ماتھے سے خون بہہ رہا تھا اور میرے شوہر پریشانی سے میرے اوپر جھکے ہوئے تولیہ سے میرا خون پونچھ رہے تھے۔

ماتھا پھٹ جانے کی وجہ سے میرے سر میں شدید درد تھا لیکن اس کے باوجود میں زور سے ہنس پڑی اور ایکبار اپنے آپ کو بیوی کے روپ میں دیکھ کر خدا کا شکر بجا لائی۔

★★

حرفوں کے بنے

تیز رفتار مشینی زندگی نے انسان کو اتنا گھن چکر بنا دیا ہے، کہ اب وہ بات تک شارٹ ہینڈ میں کرنے لگا ہے۔ امریکی بے چارے مفت میں بدنام ہیں کہ وہ بات کم کرتے ہیں اور کھاتے زیادہ ہیں یعنی پورے پورے لفظ، جملے اور پیراگراف تک کھا جاتے ہیں، ورنہ سچ پوچھیے تو ہم لوگ کون سا لانگ ہینڈ میں باتیں کرتے ہیں۔ حرفوں کے بنے آدمی سے تو آپ کا پالا اکثر پڑا ہوگا، لیکن اب ذرا حرفوں کے بنے الفاظ کی کرامات بھی دیکھیے۔

ابھی کچھ دن پہلے کا واقعہ ہے، کہ میری ایک عزیز سہیلی مقامی زنانہ ہسپتال میں علاج کے لئے داخل ہوئیں۔ مجھے بھی خبر لگی۔ بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچی۔ بہ مشکل تمام ان کا وارڈ اور بیڈ نمبر ڈھونڈنے میں کامیاب ہو سکی، لیکن ان کا بیڈ خالی تھا۔ نرسوں، مریضوں اور تیمارداروں کے ہجوم میں خالی بیڈ کے چکر لگاتے دیکھ کر ایک نرس نے پوچھا۔

"بیگم صاحب! کیا تم مسز زلفی کو ڈھونڈنا مانگتا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اوہ آپ نے بڑا دیر کر دی، وہ تو او۔ ٹی چلا گیا۔"

"ارے کیوں؟"

"رات اس کا حالت سیریس ہو گیا اس لیے اس کا آپریشن ضروری ہو گیا۔"

"لیکن اس کے او ٹی جانے کی ضرورت کیا تھی؟ کیا آپریشن یہاں نہیں ہو سکتا تھا؟"

اس نے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف استہزائیہ نظر سے دیکھا "یہاں!.... یہاں

کیسے ہونے سکتا تھا بابا، اس کے لئے تو انھیں او ٹی جانا ہی پڑتا۔"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نرسوں کے ہجوم میں غائب ہو گئی اور میں کفِ افسوس ملتی گھر واپس پہنچی، کہ اگر کل ہی شام کو ہسپتال پہنچ جاتی، تو عیادت تو ہو ہی جاتی۔

لیکن سب سے زیادہ افسوس تو اس وقت ہوا جب ہمیں پتہ چلا کہ او ٹی سے مراد محض "آپریشن تھیٹر" تھا، نہ کہ جنوبی ہند میں واقع اوٹی پہاڑ۔

ہم اپنے آپ کو اس وقت تو واقعی بالکل بے بس اور مجبور پاتے ہیں جب کسی محفل میں اس طرح کی گفتگو چھڑ جاتی ہے "آپ کو پتہ نہیں کہ اے آر صاحب کا تقرر ٹیلکو میں سی آر ٹی ایکس پر ہو گیا۔ سی، آر، ٹی، ایکس اب' سی سی ہو کر جی کے پی جا رہے ہیں۔۔۔ ہاں، ڈی، این کا نیا دلہ تو " ایم، پی " ہو گیا۔۔۔ تعجب ہے صاحب آپ کو ڈی، ٹی، ایس صاحب نہیں ملے، حالاں کہ انھوں نے کل ہی "ایس، ایم" کو "ٹی، سی" کر دیا تھا کہ" جی، ایل "سے آج رات کو وہ آ رہے ہیں، کیا انھوں نے آپ کو خبر نہیں دی۔

جی، ایل (لکھنؤ گوہاٹی ایکسپریس) کا بھی ایک بہت ہی پُر لطف واقعہ ہے' پرسوں صبح ہی صبح آصف میاں گھر پہنچے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے۔

" آنٹی! میں جی ایل سے آ رہا ہوں۔"

اماں نے سنتے ہی سر پیٹ لیا۔

"ہے ہے، یہ صبح، ہی صبح کیسے منحوس کلمات منہ سے نکال رہا ہے!"

آصف بولا۔ "نانی اماں! جی ایل ہی سے تو آ رہا ہوں۔"

"بس تو ماننے کا نہیں، بکتا ہی جائے گا اناپ شناپ۔ خدا نہ کرے کہ تو جیل جائے۔ جیل جائیں تیرے دشمن!۔"

اس پر میرے اور آصف میاں کے ہنسنے سے گھر قہقہہ زار ہو گیا۔

اور اس دن تو ڈاکیہ نے مجھے حیران ہی نہیں، بلکہ پریشان بھی کر دیا۔
بولا "آپ باہر گئی تھیں اور آپ کا "ٹی، ایم، او" کئی دن سے لوٹ رہا تھا"۔
میں نے دل ہی دل میں سمجھنے کی ناکام کوشش کی کہ یہ "ٹی، ایم، او" کیا بلا ہوتی ہے، پھر بولی۔

"اب میں آگئی ہوں۔ کل...."

"لیکن اب تو آپ کو "جی، پی، او" جانا پڑے گا"۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ آج ہی میں نے اسے ریٹرن کر دیا ہے، اب تو پی، ایم، جی سے ملنا ہو گا"۔

اب آپ ذرا میری جہالت اور اس پوسٹ مین کی قابلیت کا اس سے اندازہ لگائیے اور سوچیے، کہ "ٹی، ایم، او" "جی، پی، او" اور "پی، ایم، جی" کو سمجھنے کے لئے مجھے کتنا سر مارنا پڑا ہو گا۔

ایک سفر میں بڑا لطف آیا۔ ہمارے کمپارٹمنٹ میں چند طلبا بھی سفر کر رہے تھے۔ راستہ بھر انھوں نے اپنی "ایکٹی ویٹیز" جاری رکھیں۔ شامت کا مارا کنڈکٹر گارڈ ٹکٹ اور ریزرویشن چیک کرتا ہوا اُن تک بھی پہنچ گیا اور ان میں سے ایک لڑکے سے ٹکٹ مانگا، مگر لڑکا بالکل خاموش رہا۔ کنڈکٹر نے کئی بار ٹکٹ مانگا، لیکن وہ بالکل بے تعلق بنا بیٹھا رہا! آخر کنڈکٹر نے تنگ آکر پوچھا۔

"کیا آپ "ڈبلیو، ٹی" ہیں؟"

لڑکے نے غرّا کر جواب دیا۔

"جی ہاں، ہم ڈبلیو، ٹی ہیں، کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

لڑکے اور کنڈکٹر میں کافی جھک جھک ہوئی اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ یہ مقدمہ اگلے اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر کے سامنے پیش ہوا۔

اسٹیشن ماسٹر نے لڑکے سے ٹکٹ مانگا اور اس نے کھٹ سے ٹکٹ نکال کر دے دیا اور بولا "جناب، میں کتنی دیر سے کہہ رہا ہوں کہ میرے پاس ٹکٹ ہے لیکن یہ مانتے ہی نہیں"

"لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ ڈبلیو، ٹی ہیں"

"آپ اس کا مطلب بھی سمجھتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ ڈبلیو، ٹی کا مطلب ہوتا ہے وِداؤٹ ٹکٹ"

"لیکن ہم تو جانتے ہیں کہ ڈبلیو، ٹی کا مطلب ہوتا ہے وِد ٹکٹ"

اب تو مخفّف حروف مل کر پورے پورے لفظ بن چکے ہیں جنھیں ہم دن رات استعمال کرتے رہتے ہیں، لیکن اگر کوئی بھولے سے بھی ان میں سے کسی کا پورا نام پوچھ لے، تو ہم تو ہم، بڑے بڑے بغلیں جھانکنے لگیں اور دن میں تارے نظر آنے لگیں، مثلاً:

یونیسکو۔ یونیسف۔ ٹیلکو۔ آئی سی آئی۔ نیسف۔ سیٹو۔ ناٹو۔ بی سی جی۔ ڈی ڈی ٹی۔ ایسو۔ وغیرہ وغیرہ۔

بعض لوگ باتیں کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے "کوڈ" اور "صائفر" میں بات کر رہے ہیں "اچھا، تو آپ "ایف" کب گئے تھے:" "مجھے پی ایس، اے، گئے ہوئے تو کافی دن ہو گئے"

"سُنا ہے بی، این، آج کل "یو کے" میں ہیں" "اچھا اچھا، تو صاحبزادے آج کل "یو اے آر" میں براجمان ہیں؟"

"دیکھئے اب آئی این ٹی یو سی کب بھجوائے"

ہاں، تو ہوتا یہ ہے کہ اس قسم کے لوگ فرّاٹے سے باتیں کرتے رہتے ہیں اور ہم اور ہمارے جیسے آپ بھی ان کا مُنہ کسی حیرتی آئینے کی طرح تکا کرتے ہیں۔

ایک صاحب بہادر اپنی میم صاحبہ سے فرما رہے تھے۔

" این ایس ایف کے جی ایم نے وعدہ کیا تھا پندرہ "کے جی" شکر بھیجیں گے۔ ٹی آر او

سے یاد دلانے کا وعدہ بھی ان کے سامنے ہی کیا تھا، مگر اب تک بھیجی نہیں"۔ اب تک کے جی کلاسیز (ایک بات کان میں سن لیجیے، کہ مطلب تو اب بھی ہم اس کا نہیں جانتے) سنا کرتے تھے، لیکن کے جی شکر کا پتہ آج ہی چلا۔

آج کل ایک فیشن بڑا عام ہو گیا ہے۔ جسے دیکھیے کوئی ڈی ایل سید ہے تو کوئی اے ایم آر انصاری اور کوئی ڈی ڈی ٹی شرما اور ایم ایم قریشی بنا پھرتا ہے ان کا پورا نام ڈھونڈنے کے لئے لاکھ سر ماریے، ٹیلیفون ڈائرکٹری الٹیے پلٹیے، ہفتوں ان کے گھر چکر لگائیے، قیاس کے گھوڑے دوڑائیے، مگر کیا مجال جو پورا نام معلوم ہو سکے۔

اب مسٹر ایم۔ ایم قریشی کا احوال مجھ سے بھی سن لیجیے۔ الیکشن میں اس بار ایم ایم قریشی کی بڑی دھوم تھی۔ جدھر دیکھیے ایم ایم۔ جس سے سنیے ایم ایم۔ معلوم ہوا کہ ہماری کالونی کی کوئی بہت ہی معزز ہستی الیکشن کے میدان میں آئی ہے۔ اب جو مخالف امیدوار کے حمایتیوں نے ان کے خلاف جوابی پوسٹر نکالا تو ان کی سات پشت پبلک کے سامنے آ گئی، جس میں سب سے خاص بات یہ تھی کہ ایم ایم قریشی اسی علاقے کی پیداوار ہیں اور آپ کا اسم گرامی ہے "ماسٹر منجھو" جو ہمارے بچپن میں ہمارے یہاں سر پر ٹوکرا رکھے گوشت بیچنے آیا کرتے تھے اور نوٹنکی میں ہارمونیم سے شوق فرمانے کی وجہ سے میر منجھو سے "ماسٹر منجھو" ہو گئے تھے اور گوشت کے دھندے سے چمڑے کے کاروبار تک پہنچتے پہنچتے قریشی صاحب بن بیٹھے اور پھر خدا نے ایسی برکت دی کہ ماسٹر منجھو سے "ایم ایم" ہو گئے۔

ایک بار تو ہم اچھی خاصی پریشانی میں پڑ گئے۔ ہم نے جو ٹیچری کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھایا تو ایک ہفتے تک ادھر ادھر کے مضامین پڑھاتے اور خالی پیریڈ لیتے رہے۔ ایک دن پرنسپل نے بلا کر فرمایا "نئے روٹین چارٹ میں اپنا روٹین دیکھ لیجیے۔ اس کے مطابق آپ کو مستقل طور پر پڑھانا ہوگا"۔ چارٹ دیکھ کر تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میرے نام کے ساتھ ذیل کی تفصیلات درج تھیں:

" ای ڈی ایس X　　　ای ای سی XI

" ای جی ایم XII　　　ڈی ایس سی XI

وغیرہ۔ یہ مضامین میں نے تو کیا، میرے خاندان میں کسی نے نہیں پڑھے۔ میری پریشانی دیکھ کر اسٹاف روم میں زبردست قہقہے پڑے۔ مجھے کافی پریشان کر لینے کے بعد جب ان مضامین کے بارے میں بتایا گیا تو پتہ چلا کہ یہ تو محض روزمرّہ کی سائنس، ابتدائی ہائجین، اور ڈومیسٹک سائنس تھی۔

آخر میں حرفوں کے بنے کی ایک کرامت اور ملاحظہ فرمایئے۔

گذشتہ دنوں تین چار سال کے بعد چچا چھمّو کے یہاں جو پہنچی تو باہر "نیم پلیٹ" دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بڑے خوشنما حروف میں لکھا ہوا تھا۔

"شکیل احمد صدیقی آئی اے ایس"۔ ارے تو یہ کھلنڈرا پڑھنے میں بدشوق اور کند ذہن سا لڑکا جو میٹرک میں متواتر چار سال تک فیل ہوتا رہا "آئی اے ایس" ہو گیا۔ یہ تو گویا معجزہ ہو گیا اور اسی خیال کے ساتھ گھر میں گھستے ہی مبارکباد کا نعرہ لگا کر ان سے مٹھائی کا تقاضا کر دیا۔ چچی بولیں۔

"ارے اطمینان سے بیٹھو تو مٹھائی بھی جی بھر کر کھا لینا لیکن آخر کس تقریب میں؟"

"لیجئے میرا بھائی "آئی اے ایس" ہو گیا، آپ نے ہمیں خبر تک نہ دی۔ اب مٹھائی کھلانے کی وجہ اوپر سے پوچھ رہی ہیں"

"لو بیٹا، یہ آئی اے ایس موئی کیا بلا ہوتی ہے؟"

اور مجھے چچی کی جہالت پر رونا آ گیا، بیٹا آئی اے ایس ہو گیا اور انھیں اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں معلوم۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد میں اپنی جہالت پر سر پیٹ رہی تھی جب شکیل میاں نے بتایا "آئی اے ایس" کا مطلب ہوتا ہے "انٹر آرٹس اسٹوڈنٹ"

★★

ہیٹ والا صاحب

صبح محلہ میں بڑی ہلچل تھی، زبان زدِ خاص و عام تھا۔

"ہیٹ والا صاحب مر گیا۔"

ہمارا ملازم جب بازار سے سودا لے کر آیا تو بولا۔

"بی بی جی! کچھ خبر ہے! ہیٹ والا صاحب مر گیا۔"

"ہاں پتہ تو ہے، پر انھیں ہوا کیا تھا؟"

"کچھ نہ پوچھو بی بی، صاحب کا کمرہ دو دن سے اندر سے بند تھا۔ جمن ہوٹل والے کا چھوکرا کھانا لے کر جاتا اور واپس لاتا رہا۔ بی بی لوگ صاحب کو برا کہتے تھے لیکن وہ بہت اچھا تھا، غریبوں کی بڑی مدد کرتا تھا۔

ملازم تھوڑی دیر تک افسوس کر کے چلا گیا، لیکن مجھے ایسا لگا گویا صدیوں کے دروازے میرے سامنے کھل گئے۔

میرے سامنے ان کی مختلف تصویریں گھومتی رہیں۔ بہترین سوٹ میں ملبوس چچا فیض، ٹینس کی سفید پینٹ، قمیص اور شوز میں ملبوس چچا فیض، شوخ بلیزر میں رنگین مزاج چچا فیض، موٹر نشین چچا فیض، اسکوٹر نشین چچا فیض، سائیکل نشین چچا فیض اور سب سے آخر میں ہارے ہوئے پیدل چچا فیض۔

سمجھ میں نہیں آتا کس چچا فیض کو یاد کروں، اس چچا فیض کو جس کی کار کا ماڈل ہر سال ان کی قسمت کی طرح بدلتا رہا، یا اس چچا کو جو تقدیر سے مات کھا کر پیدل چلنے پر مجبور ہو گیا۔ اس چچا کو جس کے باغ کا ایک ایک گوشہ نادر و نایاب قسم

کے پھلوں اور پھولوں سے جنت کا نظارہ پیش کرتا تھا یا اس بچا کو جس کے باغ کے ایک ایک گوشہ پر چھوٹے چھوٹے مکان، جھونپڑیاں اور دکانیں بن چکی تھیں اس گیریج کو یاد کروں جس میں ان کی شان دار کاریں رہا کرتی تھیں یا اس گیریج کو جس کی ایک ایک اینٹ ان کی اینٹ سے اینٹ بجا گئی۔ ان کے ایک کمرے کی سجاوٹ کو یاد کروں یا پارٹیشن زدہ ایک ایک، دو دو کمروں کے لڑتے جھگڑتے مالکوں کو، اس غسل خانہ کو یاد کروں جن کی بالٹیوں میں رات کو جوہی چنبیلی اور موتیا کے تازہ پھول ڈال دیئے جاتے ہیں کہ خوشبو سے بسے ہوئے پانی کو وہ دوسرے دن استعمال کر سکیں، یا شاگرد پیشہ کی اس ٹوٹی پھوٹی گندی کوٹھری کو جو اب ان کا مستقل بسیرا تھی۔

مجھے ان کی نفاست یاد آرہی تھی۔ خوشبو میں بسے ہوئے اجلے، بے داغ کپڑے یاد آرہے ہیں۔ دھیرے دھیرے اجلاپن ان کی زندگی سے دور ہوتا گیا۔ وہ رنگین پھر شوخ کپڑے پہننے لگے۔ ناک پر رومال اور سر پر ہیٹ ان کے لباس کا جزو خاص بن چکا تھا۔ رات ہو یا دن، جاڑا ہو یا گرمی، بہار ہو یا برسات، ہیٹ ان کے سر سے اتر کر کھونٹی کی زینت کبھی نہیں بنا، یہاں تک کہ لوگ اب انھیں ہیٹ والا صاحب کہنے لگے تھے۔ جس طرح ان کی زندگی نفاست سے کثافت میں داخل ہو چکی تھی اسی طرح ان کا ہیٹ بھی کثیف سے کثیف ترین ہو کر اپنی رنگت کھو چکا تھا۔ فیشن ایبل ہیٹ جو باقاعدہ فیشن کے مطابق بدلے جاتے رہے تھے اب اپنی تبدیلی کا سلسلہ بھی ختم کر چکے تھے اور سالہا سال تک بڑا سا بدوضع بدنما ہیٹ ان کے سر کی سفیدی کو کالے پن میں بدلتا رہا۔

میرے دماغ میں ان کی مختلف تصویریں ابھرتی رہیں اور مٹتی رہیں، مجھے یاد آیا، کبھی وہ اپنی حویلی نما کوٹھی میں پانچ عدد پیارے پیارے پھول سے بچوں بیوی، اور درجنوں ملازموں کے ساتھ رئیسانہ ٹھاٹھ سے رہتے تھے، اتنے لوگوں کے

زیچ رہنے والا شخص آج یکہ و تنہا بے بسی اور کس مپرسی کی حالت میں مر گیا۔ وہ شخص جس کے دستر خوان پر شہر کے بڑے لوگ بیٹھنا فخر محسوس کرتے تھے، آج بھوک کی سختیاں اٹھاتا ہوا ختم ہو گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کی شاندار حویلی کے پیچھے میرا چھوٹا سا گھر تھا۔ پڑوسی ہونے کے ناطے ہم انھیں چچا فیض کہتے تھے۔ چچا کو بچوں سے بڑا پیار تھا ان کی لڑکی فرزانہ سے میری پکّی دوستی تھی۔ میں ہر روز ان کے یہاں جاتی تھی، کیونکہ ہر شام وہ بچوں کو جمع کر کے ٹافیاں بانٹا کرتے تھے۔ چچی برابر میرے گھر آتی رہتیں، اماں سے ان کی کھسر پھسر چلتی، وہ آنسو پونچھتی جاتیں اور باتیں کرتی جاتیں۔ اماں انھیں سمجھا بجھا کر ان کے گھر واپس بھیج دیتیں، لیکن چچا فیض کی رنگین طبیعت ان کے لئے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی، وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ یہ سب کچھ وہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ ایک دن ہم نے سُنا، چچی اپنے بچوں کو لے کر میکے چلی گئیں ہمیشہ کے لئے اور.... اس دن سے ان کے گھر پر سنّاٹوں کا راج ہو گیا۔

چچا فیض اس واقعہ سے ٹوٹ سے گئے۔ انھیں چچی سے جو والہانہ محبت تھی، اسے وہ سمجھ نہ سکی۔ ان کی رنگین مزاجی محض ذوقِ نظر کی تسکین کے لئے تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کا یہ ذوقِ نظر دیوانگی کی سرحدوں کو چھو رہا تھا، جس کی تسکین کے لئے وہ مختلف بھیس میں مختلف شہروں میں جا کر حسیناؤں کا دیدارِ عام کیا کرتے۔ کبھی چوڑی والے کے بھیس میں، کبھی پھیری والے کی شکل میں، کبھی ٹینس کے کھلاڑی کے روپ میں، کبھی ٹیوٹر کی حیثیت سے۔ چچی ٹھہریں ایک گھریلو عورت، وہ اتنی اونچی چیز کیسے سمجھتیں وہ تو ان حرکات کو حد سے گری ہوئی بات سمجھتی تھیں۔ ان ہی باتوں نے چچی کو ان سے بہت دور کر دیا۔

باہر سے خوش مزاج چچا اندر سے بہت دکھی رہنے لگے۔ وہ جب کبھی ہمارے یہاں

آتے، چچی کی خیریت پوچھتے، ایسا کرتے وقت ان کے لبوں سے آہ نکل جاتی اور پھر ایک
دن ہم نے سنا، چچی سرحد پار کرکے دیارِ غیر میں جا بسیں۔

چچا کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا، وہ اس میں بہہ گئے۔ جائداد بکنے لگی۔
عیش کے سامان خریدے جانے لگے۔ دوستوں کا ایک ہجوم ہر وقت ان کے ارد گرد
موجود رہنے لگا، انھوں نے اپنے خوبصورت باغ کو اپنے ہاتھوں ویران کر دیا۔ گھر کے
چاروں طرف کی زمینیں، کوڑیوں کے مول بکنے لگیں۔ ہر طرف اونچی نیچی، چھوٹی بڑی
ٹیڑھی ترچھی دیواریں کھڑی ہوگئیں۔ چچا کی آسمان کو چھوتی ہوئی کوٹھی اب صرف
ایک منزل کی رہ گئی تھی، جس کے ہر کمرہ میں کوئی نہ کوئی کرایہ دار، رشتہ دار یا
دوست بس گیا۔

گھریلو زندگی گذارنے کی خواہش ان کی حسرت بن چکی تھی۔ حسینوں کو تاکنے
جھانکنے کا مرض شباب پر پہنچ چکا تھا۔ شہر میں شادی ہو یا بیاہ یا کوئی اور تقریب'
چچا کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر زنان خانہ میں پہنچ جاتے یا اس دروازے کے قریب کھڑے
ہو جاتے جہاں سے خواتین اندر جاتیں۔ اس سلسلہ میں گالیاں بھی سنتے، دھکّے بھی کھاتے،
لیکن جاتے ضرور۔ خوبصورت لڑکیوں کے نام اور پتے کے پیچھے سرگرداں رہتے۔ پھر اُن
کے والدین کے یہاں پیغام بھیجتے۔ نتیجہ کیا ہوتا، بتلانے کی ضرورت نہیں۔

محلّے کے لڑکوں کو ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا تھا۔ لڑکیوں کی طرف سے
ان کو خط بھجواتے، کچھ دنوں تک خط وکتابت چلتی، پھر تحفے وصولنے کا سلسلہ شروع
ہوتا، پھر ملاقات کا ایک دن مقرر ہوتا جو اُس Activity کا آخری دن ہوتا۔
ان کی مرمّت ہوتی اور لڑکی کی مذمّت — اور کچھ ہی دنوں بعد ان کا نیا عشق
پھر شروع کر دیا جاتا۔

چچا فیض کو اپنی خوبصورتی اور جوانی کی پرچھائیوں پر بڑا فخر تھا۔ ان کے

خیال میں شہر کی ساری لڑکیاں ان پر جان دیتی تھیں، چنچل اور شریر لڑکیاں ان کو اپنے مذاق کا نشانہ بناتیں، آخر ستر بہتر سال کے آدمی سے خوف کس بات کا ہو سکتا تھا۔

آخر وقت میں چچا فیض کی تمام رنگین مزاجی ایک عدد شادی کی حسرت میں بدل چکی تھی اور وہ غالباً مرتے دم تک شہر کی سب سے نوخیز حسینہ کو اپنی دُلہن بنانے کے خواب دیکھتے رہے۔ اس خواب کی تعبیر کو دیکھنے کے لیے انھوں نے نہ جانے کتنے دھکّے کھائے، کتنے پیسے خرچ کیے۔

آج ہمارے چچا فیض اور شہر والوں کے ہیٹ والے صاحب ختم ہو چکے۔ ایک لمبی کہانی ختم ہو گئی۔ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ آخری وقت میں ان کے سر کے نیچے ہیٹ تھی، ایک ہاتھ میں رومال اور دوسرے میں ایک لفافہ..... شاید آخری بار اُن کی شادی کی بات چیت کہیں سے چھوٹی تھی.....!

بھولنے کی مصیبت

ایک مرتبہ کسی تقریب میں ایک صاحبہ میری دائیں جانب کی سیٹ پر تھیں چہرہ بڑا ہی پرکشش تھا لیکن غیر معمولی تن و توش کی شخصیت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ انھیں کہیں دیکھا بھی ہے۔ تقریب ختم ہونے پر میرے شوہر ان خاتون اور ان کے شوہر سے باتیں کرتے ہوئے میرے پاس آگئے اور بولے۔

"ان سے نہیں ملیں ؟"

اور میں ان سے باتیں کرنے لگی۔ باتوں کے دوران میں نے ان سے کہا "معاف کیجئے گا، میں بار بار آپ کی طرف دیکھ رہی تھی، دراصل آپ کی شکل ان کے دوست ساجد صاحب کی بیگم سے بہت ملتی ہے۔"

اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا اور میرے شوہر بولے "یہ مسز ساجد ہی تو ہیں، ان کے یہاں تم جا بھی چکی ہو"۔ مجھ پر شرمندگی کا دورہ سا پڑ گیا۔ میں جھینپ مٹانے کے لئے بولی۔

"معاف کیجئے گا، آپ کی صحت پہلے سے ماشاء اللہ کچھ اچھی ہو گئی ہے۔"

یہ بات کہتے ہوئے مجھے اس بات کا بالکل خیال نہ رہا کہ دنیا کی زیادہ تر عورتیں اپنے آپ کو نازک اندام سمجھتی ہیں۔ انھوں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"ایسی قسمت کہاں بہن، بیماریاں بلا کی طرح چمٹی رہتی ہیں۔ چہرہ تک تو ہرا ہوتا نہیں، تب مجھے خیال آیا کہ واقعی کسی موٹی عورت کو موٹا کہنا، کسی موٹی گالی سے کم نہیں، اور مجھے ایک بار پھر معذرت کرنی پڑی۔

بات یہیں تک رہتی تو ایک بات بھی تھی، مجھے تو لوگوں کے پتے نہیں یاد رہتے، خطوں کے جواب لکھنا بھول جاتی ہوں، خط لکھ لیتی ہوں تو پتہ دماغ سے نکل جاتا ہے۔ ڈائری اور نوٹ بک کی مدد سے پتہ لکھ لیا تو پوسٹ کرنا بھول گئی اور خوش قسمتی سے پوسٹ کر بھی ڈالا، تو ٹکٹ لگانا بھول گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیرنگ مجھے ہی واپس مل جاتا ہے۔

ٹیلیفون کے نمبر تو کبھی یاد نہیں رہتے۔ ڈائرکٹری میں بہت احتیاط سے کسی کا فون نمبر دیکھ کر نوٹ کر لینے کے باوجود صحیح نمبر رِنگ کرنا بھول جاتی ہوں، ابھی کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ ایک جگہ ٹیلیفون کرنے کے لئے نمبر ملانے کے بعد جب ریسیور اُٹھا کر کان سے لگایا تو اُدھر سے ایک بڑی ہی دبنگ اور خوفناک آواز کان میں آئی: "ہیلو! آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"کیا مسز صدیقی گھر پر ہیں؟" میں آواز سے خائف ہو کر کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہاں کوئی مسز صدیقی نہیں رہتیں۔ یہ بنٹری کرشنم آچاریہ آئی، جی کا بنگلہ ہے، آپ کون صاحبہ بول رہی ہیں؟"

اُدھر سے تقریباً ڈپٹی ہوئی آواز آئی۔ آئی جی کا نام سن لینے کے بعد بھی اپنا نام بتا دیتی، اتنی بڑی حماقت کیسے کر سکتی تھی "سوری، رانگ نمبر!" کہہ کر جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔

ڈائرکٹری میں ایک بار پھر ان کا فون نمبر دیکھا، بہت احتیاط سے اسے ایک کاغذ پر نوٹ کیا اور پھر ڈائل گھمایا۔

"ہیلو —" اُدھر سے آواز آئی۔

"کیا مسز صدیقی گھر پر تشریف رکھتی ہیں؟"

"یہ کیا تماشہ ہے، آپ سے کتنی بار کہا جائے کہ مسز صدیقی کا گھر نہیں ہے آئی جی صاحب کا بنگلہ ہے آئی جی صاحب کا، سمجھیں؟"

اُدھر سے وہی شخص کاٹ کھانے والے انداز میں دھاڑا اور اس کے بعد ہفتوں کہیں فون کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

بھولنے کی مصیبت تو میری روزانہ کی زندگی پر ہی چھائی ہوئی ہے۔ کیا مجال کہ میری اپنی ہی رکھی ہوئی کوئی چیز آسانی سے وقت پر مجھے مل جائے۔ اب ایک چھوٹی سی چیز رومال ہی کو لیجئے۔ میرے ہاتھوں سے رومال جس قدر گم ہوتے ہیں اتنی شاید کوئی اور چیز نہ کھوئی ہوگی۔ گھر تو دوپٹہ اور ساری کے آنچل رومال کے کام بخوبی انجام دے دیتے ہیں، لیکن باہر جانے کے لئے تو رومال کا ہونا ضروری ہے، لیکن میرے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ ہر بار میں رومال کھوتی ہوں اور پھر نئے بنا کر یا خرید کر رکھتی ہوں، لیکن کیا مجال کہ وہ وقت پر مجھے مل جائیں۔ رومالوں کا کیس ہمیشہ خالی ملتا ہے، کیونکہ میں ہمیشہ اس میں رومال رکھنا بھول جاتی ہوں، اور اگر اتفاق سے اس میں رکھ بھی دیا تو کیس کہاں رکھا ہے، بھول جاتی ہوں۔ اس لئے گھر سے باہر نکلتے وقت دوبارہ اس تلاش کی مصیبت سر پر کھڑی ہوتی ہے، ایک تو تیار ہونے سے پہلے یہ بکس، وہ بکس، الماری، دراز، سنگار میز کے خانوں کا بار بار جائزہ لینے کے بعد کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر میلا، پھٹا، پرانا اور بدرنگ رومال نکال کر احتیاط سے رکھ لینے کے باوجود چلتے وقت پھر اس کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ ابھی ابھی یہ رومال کہاں گیا۔ میز پر، سنگار میز پر، کھانے کی میز پر، بک شیلف پر، ریڈیو سیٹ پر حتیٰ کہ باورچی خانے، غسل خانے میں بار بار جستجو پر کہیں نہ کہیں سے رومال برآمد ہو ہی جاتا ہے، لیکن جب دعوت کے بعد ہاتھ پونچھنے کے لئے رومال دیکھتی ہوں تو وہ پھر غائب۔ غالباً رکشے میں گر گیا یا جہاں بیٹھی تھی وہیں رہ گیا۔

ایک آفت اور میرے ساتھ رہتی ہے۔ وہ کنجیوں کے کھونے کی مصیبت
بار بار کی مصیبت سے بچنے کے لئے ڈپلی کیٹ اور ترپلی کیٹ کنجیاں تک بنوائیں
لیکن وقت پر سب غائب ہو جاتی ہیں۔ گھر سے باہر جاتے وقت اکثر ہمارے گھر
کا نقشہ یہ رہتا ہے، تکیے اُلٹے ہوئے، گدّے، کرسیوں کی گدّیاں، توشک، لحاف
اُلٹ پلٹ، سنگار کی درازیں باہر کو نکلی ہوئیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے، کہ گھر کا نقشہ
بدل جانے کے بعد بھی جب کنجیوں کا گچھا نہیں ملتا تو مجبور ہو کر ہم جانے کا پروگرام
کینسل کر دیتے ہیں، کیوں کہ گھر کھلا چھوڑ کر جایا نہیں جا سکتا اور بازار سے اتنی جلدی
نیا تالا خرید کر لایا نہیں جا سکتا۔ مایوس ہو کر جب ساری بدلنے کے لئے اتارنے
لگتی ہوں تو حیرت سے چیخ پڑتی ہوں "ارے یہ رہا گچھا، ساری میں لگا مرداڑ کر میں
جھول رہا تھا۔"

تو صاحب یہ واقعات اس تنِ ناتواں کے اوپر ہمیشہ گذرتے رہتے ہیں۔
لوگوں نے بہت سی ترکیبیں بتائیں اور میں نے بڑی احتیاط سے انھیں اپنی نوٹ بک
میں نوٹ بھی کر لیں لیکن ستم یہ بھی ہے کہ ہمیشہ وقت پر وہ نوٹ بک ہی نہیں ملتی،
کیونکہ میں یہ بھول جاتی ہوں کہ وہ نوٹ بک رکھی کہاں تھی۔

گھڑی میں بڑی باقاعدگی سے لگاتی ہوں، لیکن اس میں چابی بھرنا اور وقت
دیکھنا بڑی بے قاعدگی سے بھول جایا کرتی ہوں۔ اس لئے جب تک میرے شوہر کی
نائٹ ڈیوٹی ہوتی ہے، صبح ٹائم پیس بند ملتا ہے، اور گھر سے باہر نکلتے وقت میری
رسٹ واچ بند ہوتی ہے۔

ایک اور مصیبت میرے ساتھ ہے۔ لوگوں کے چہرے یاد رہتے ہیں، نام بھول
جاتی ہوں، نام یاد رہا تو چہرہ ذہن سے غائب، اکثر دو چار بار کی ملاقات کے بعد
کسی بڑے مجمع میں کسی بھی ملاقاتی کو دیکھ کر سوچتی ہی رہ جاتی ہوں، کہ انھیں

کہاں دیکھا تھا۔ اکثر کسی تقریب سے واپسی پر میرے شوہر کہتے ہیں۔

"بھئی ــــ صاحب مجھ سے باتیں کر رہے تھے، تم نے سلام نہیں کیا، شہر کے معزز آدمی ہیں، کیا سوچا ہو گا۔"

'یا یہ کہ :ــــ

"میرے دوست اسلم صاحب کہہ رہے تھے، کہ بھابی مجھ سے خفا ہیں۔ فلاں جگہ ملی تھیں، مجھ سے بات نہیں کی، ان سب باتوں سے مجھے اس قدر خوف ہے کہ اب تو جو شخص میری طرف ذرا بھی غور سے دیکھتا ہے، میں جھٹ سے اسے سلام کر لیتی ہوں۔ لیکن اکثر اس سے بڑے پُر لطف واقعات پیدا ہو جاتے ہیں۔

ایک بار راج بھون میں ہم دونوں مدعو تھے۔ دربار ہال کے عین گیٹ سے داخل ہوتے وقت دروازے کے کونے میں کھڑے ایک شخص پر میری نظر پڑی، وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور ہاتھ کے اشارے سے اندر جانے کو کہا۔ میں ایک منٹ کے لئے سوچنے لگی۔ یہ کون شخص ہو سکتا ہے۔ غالباً یہ مجھے جانتا ہے، ممکن ہے یہ شہر کا کوئی معزز شخص ہو، اتنا سوچا تھا کہ میں نے درباری آداب کے مطابق جھٹ سے جھک کر سلام کر لیا، آس پاس کھڑے کچھ لوگوں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ کچھ دبی دبی سی ہنسی کی آوازیں بھی سُنائی دیں۔ میرے شوہر آہستہ سے بولے۔

"یہ کیا کر رہی ہو، یہ تو یہاں کا دربان ہے۔"

اگر بھولنے کی عادت مجھ ہی تک رہتی، تو ایک بات تھی، لیکن میری ملازمہ اس معاملہ میں مجھ سے کم نہیں، اس کی یہ عادت اس حد تک پہنچ چکی ہے، کہ وہ کبھی تو دال میں نمک ڈالنا بھول جاتی ہے تو کبھی نمک میں دال ڈالنا۔ کبھی سالن پر محض مرچوں کے سالن کا گمان ہوتا ہے تو کبھی کسی مریض کے سوپ کا۔ چائے دان میں چائے کی پتی ڈالنا اگر وہ بھول جائے تو ہمارے لئے یہ کوئی خاص واقعہ نہیں، اگر شکر

دودھ اور رنگ کے اعتبار سے چاہے بالکل ٹھیک ہی ہو تو ہمارے لئے یہ حیرتناک بات ہے۔

ان بھولوں اور ان کھانوں کے ہم اس قدر عادی ہو چکے ہیں، کہ ان بھولوں کے بغیر کھانے کا کچھ لطف نہیں آتا، لیکن اس کی لوگوں کے نام بھول جانے کی عادت اکثر بڑا دلچسپ لطیفہ پیدا کر دیتی ہے۔ والی صاحب کو "گالی صاحب" احسن رضوی صاحب کو "آسن دوسری" صاحب کہنا تو ایک دلچسپ بات تھی لیکن ایک بار تو اس نے حد کر دی۔ یوسف سرسوی صاحب ہمارے یہاں تشریف لائے۔ انھوں نے باہر سے آواز دی۔ ملازمہ آکر بولی: "بھیا یوسف سسری صاحب آپ کو پوچھ رہے ہیں"۔ ہم دونوں کا ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا، اور جب یوسف صاحب کو ان کے نئے خطاب سے متعارف کرایا گیا، تو دل ہی دل میں برا ماننے کے باوجود ہنس دیئے۔

یہ بھولنے کی عادت ہی کچھ ایسی ہوتی ہے، جو کبھی تو ہنساتی ہے اور کبھی رُلاتی ہے۔ اب ہمارے شوہرِ نامدار کو لیجئے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ گھر میں کسی طرح کی بے قاعدگی نہ ہو۔ ہر چیز اپنی جگہ پر فٹ فاٹ ہونا چاہیئے لیکن بڑی باتیں بھول جایا کرتے ہیں۔ جب یہ دفتر کے علاوہ گھر سے باہر کہیں بھی جاتے ہیں، کھانا، پینا، سونا، آرام کرنا اور جہاں تک میرا خیال ہے گھر تک کو بھول جاتے ہیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ان کا جانا کسی سے ملنے جلنے، گھومنے یا کسی اشد ضروری کام کے سلسلے میں ہو۔ یہی نہیں، وہ شاپنگ کرتے وقت یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ جیب میں کتنے روپے ہیں یا ہیں بھی کہ نہیں۔

ایک بار ہم کچھ ضروری سامان خریدنے بازار گئے۔ ہمارے ساتھ ہماری آٹھ سالہ بھانجی دیبا بھی تھی۔ کھلونوں کی ایک بڑی دکان کے سامنے وہ مچل گئی۔ "خالہ جان ہم گڑیا

یا سے لے کر دوکان میں گھس گئے

"اچھا بیٹے تمہیں کیسی گڑیا چاہئے؟"

"جی! وہ جیسی شونی کے پاس ہے۔ آنکھیں کھولنے اور بند کرنے والی اور جو ہنستی اور روتی بھی ہے
خالو جان مجھے ویسی ہی گڑیا لا دیجئے۔"

دوکاندار نے گڑیوں کی ڈھیری لگا دی اور دیبا نے ایک بڑی سی گڑیا پسند کرلی۔
"اچھا اور کیا لوگی۔" یہ پھر بولے اور اس نے جھٹ سے ایک اور کھلونا پسند کرلیا۔ انہوں نے کھلونوں کی پیکنگ کا آرڈر دے دیا لیکن کیش میمو دیکھ کر حضرت کو تارے نظر آگئے

۷۰/۹۵ ستر روپے پچانوے پیسے۔

"جناب! یہ ستر روپے پچانوے پیسے کیسے آپ کی دکان پر تو صریحاً لوٹ ہے۔"

"واہ جناب! سارے بازار میں اس گڑیا کی یہی قیمت ہے۔ پچپن روپے کی گڑیا ہے اور پندرہ روپے پچانوے پیسے کا یہ دوسرا کھلونا۔"

میں خاموشی سے تماشا دیکھ رہی تھی۔ دیبا بڑا سا پیکٹ اٹھائے خوشی کے مارے اچھل رہی تھی اور یہ جب پینٹ و کوٹ کی تمام جیبیں جھانک لینے کے بعد بغلیں بھی جھانک چکے تو میری طرف بڑھے اور چپکے سے بولے

"میں تو سمجھا تھا یہ کھلونے کی دوکان ہے لیکن یہ تو باٹا کی دوکان نکلی۔ میری جیب میں تو پورے پندرہ روپے بھی نہ ہونگے کچھ دو بھئی عزت کا معاملہ ہے۔"

تو صاحب عزت کو بچانے کے لئے جو ضروری چیزیں خریدنے کے لئے میں گھر سے نکلی تھی انہیں کٹ کیا اور دوکاندار صاحب کا حساب صاف کیا۔

یہی نہیں ٹرین میں انھیں تمام ڈبے ایک سے لگتے ہیں اور کالونیوں میں مکان ایک سے اس لئے وہ کسی کالونی میں کسی کا گھر آسانی سے ڈھونڈ سکتے ہیں اور نہ ہی کسی ڈبہ میں بیٹھ کر کہیں اسٹیشن پر اتر کر وہ اپنا ڈبہ آسانی سے ڈھونڈ سکتے ہیں۔ اکثر وہ کسی اسٹیشن پر بھول کر دوسرے ڈبہ میں جا بیٹھتے ہیں اور جب ٹکٹ چیکر ٹکٹ چیک کرنے آتا ہے تو اپنا گھر یعنی اپنا کمپارٹمنٹ یاد آتا ہے۔
ان کی بھول کا ایک دلچسپ واقعہ سنیئے۔

ایک بار ہم فرقت کاکوروی صاحب مرحوم کے یہاں گئے ہوئے تھے۔ وہاں ان کے بھائی توفیق

اور ان کی بہن حبیبہ خاتون بھی تھیں۔ ہم لوگوں کے جاتے ہی فرقت صاحب نے سب کا باقاعدہ تعارف کرایا پھر باتیں ہونے لگیں۔ فرقت صاحب کی دلچسپ باتوں میں وقت کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ باتوں کی رو میں 'یہ' بھول چکے تھے کہ فرقت صاحب اپنے بھائی اور بہن سے ہمارا تعارف کرا چکے ہیں۔ چلتے وقت 'یہ' ان کی بہن سے بولے

"یہ تو بتائیے کہ آپ ان دونوں میں سے کس کی بیگم ہیں؟"

توفیق صاحب کا چہرہ شرم اور غصہ سے لال ہو گیا لیکن فرقت صاحب معاملہ کو سنبھالتے ہوئے اپنی مخصوص ہنسی ہنس دیئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

بھولنے کی عادت کے شکار ہم دونوں ہی ہیں لیکن لطف کی بات تو یہ ہے کہ برابر ایک دوسرے کی غلطی پکڑنے کی ٹوہ میں رہتے ہیں لہٰذا گھر آ کر میں نے ان کی غلطی کی طرف توجہ دلائی اور سمجھایا کہ ایسی غلطی نہیں کرتے بہت معیوب بات ہے۔ تو ہنس کر بولے خدا کا شکر ہے میں ویسی غلطیاں نہیں کرتا۔

"کیسی غلطیاں؟"

"تو سنو ایسی غلطیاں۔"

ایک بار میرے ایک دوست اپنی کار میں بیٹھ کر دفتر سے گھر جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک جگہ بھیڑ کی وجہ سے انہیں رک جانا پڑا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ ماجرا کیا ہے وہ بھی کار سے اتر کر بھیڑ میں گھس گئے وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا بچہ چیخ چیخ کر رو رہا ہے اور پوری پبلک اسے چپ کرانے میں شور مچا رہی ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ کسی کا بچہ اپنے والدین سے بچھڑ گیا۔ وہ اتنا چھوٹا ہے کہ نہ تو اپنے والدین کا نام بتا سکتا ہے اور نہ پتہ۔

میرے دوست کو اس بچے پر بڑا ترس آیا انہوں نے کہا لائیے میں اسے لے جاؤں گا۔ پھر بچے سے پوچھا: "بیٹے میرے پاس رہو گے؟"

اتنی محبت پا کر وہ بچہ خاموش ہو گیا اور ان سے چمٹ گیا۔ جب وہ گھر پہنچے تو دور ہی سے بیوی کو آواز دی۔

"لو بھئی، چھ بچے تو ہمارے پاس پہلے ہی سے ہیں ایک اور پال لیں گے۔"

ان کی بیوی بچے کو دیکھ کر لپکیں اور اسے سینے سے لگاتی ہوئی بولیں:

"اے ہے یہ تو اپنا ببو ہے۔ وہ پہر ہی سے غائب ہے میں تو ڈھونڈتے ڈھونڈتے پریشان ہو گئی تھی۔ خدا کا شکر ہے تمہیں مل گیا۔"

★ ★

قصہ آٹھویں خیلا کا

جب ساتوں خیلائیں اپنی کہانیاں سنا چکیں، تو ایک کونے سے ایک درد بھری آواز سنائی دی ــــ بہنو! تم اپنی اپنی کہانیاں سنا چکیں، اب میری بھی کچھ سنو۔ ساتوں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وضع قطع یا تراش خراش میں یہ آٹھویں خیلا ان ساتوں سے مختلف تھی۔ اس کے سر پر چادر کی بجائے چست برقع تھا اس کے اس برقع اور فیشن ایبل رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر وہ حیرت سے بولیں۔

"بوا تم کون ہو؟"

"میں بھی زمانے کی ستائی تمھاری ہی ایک بہن ہوں۔ مجھے ٹیڈی خیلا کہتے ہیں، میری اس وضع قطع پر مت جاؤ، میری داستانِ غم بھی تم سے کچھ کم نہیں۔"

ساتوں خیلاؤں نے کورس میں ایک آہ بھری اور اس کے گرد جمع ہو گئیں، ٹیڈی خیلا نے اپنی کہانی یوں شروع کی۔

میرے والد شہر کے ایک معزز اور امیر و کبیر شخص تھے، انھوں نے بڑے لاڈ و پیار سے میری پرورش کی اور میری تعلیم پر بے اندازہ روپیہ خرچ کیا۔ شادی سے پہلے میرا کام صرف پڑھنا لکھنا اور اسکول جانے کے بہانے سیر و تفریح کرنا تھا۔ نت نئے فیشن اختیار کرنے میں اپنا جواب آپ تھی۔

میری شادی ایک بڑے گھرانے میں ہوئی۔ میرے سسر بہت بڑے تاجر تھے، ان کا بہت بڑا مکان تھا، اور اس سے بھی بڑا خاندان تھا۔ گھر میں رنگا رنگ کے لوگ تھے۔ مجھے ان کا طور طریقہ قطعی پسند نہ تھا، وہ لوگ پرانے خیال کے تھے اور ایک دوسرے

کے ذاتی معاملات میں الجھتے رہتے تھے۔ گھر میں ہر وقت ایک طوفانِ بے تمیزی مچی رہتی۔ بڑے ایک دوسرے کی شکایت میں اور بچّے لڑائی جھگڑے میں مصروف رہتے۔ اکثر یہ لڑائی، بچوں سے ہٹ کر بڑوں تک جا پہنچتی اور کئی کئی دن تک جاری رہتی، اور بچّے مزے میں ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے رہتے۔ ایسے ماحول میں جہاں سیر و تفریح کا نام و نشان نہ تھا، میرا دم گھٹتا تھا۔

اس لئے سسرال جانے کے بعد سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا، کہ رفتہ رفتہ اپنے شوہر کو اُن کے خاندان کے ہر فرد سے متنفر کر دیا، پھر انھیں الگ رہنے پر اکسایا۔ یہاں تک کہ وہ الگ رہنے پر تیّار ہو گئے۔

الگ رہنے کے بعد مجھ پر گرہستی کا پورا بوجھ پڑ گیا۔ اب ہماری آمدنی بھی کم ہو گئی تھی، کیوں کہ میرے سسر میرے شوہر کو ہر ماہ ایک بندھی ٹکی رقم دے دیتے۔ اب ہم نوکر بھی نہیں رکھ سکتے تھے، کیوں کہ ہماری آمدنی کا آدھے سے زیادہ حصّہ میرے فیشن اور سیر و تفریح میں خرچ ہو جاتا۔ میں ہر طرح سے اپنے شوہر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی، لیکن میں دیکھ رہی تھی، کہ اب ان کے دل میں میری وہ محبّت نہیں رہی تھی۔ مجھے بڑی حیرت ہوتی، کہ میرے وہی شوہر جو ہر وقت میرے حُسن و جمال کی تعریف کرتے رہتے اور جن کی زبان میرا گُن گاتے گاتے کبھی نہ تھکتی تھی اب میرے ہر کام میں کیڑے نکالتے اور ہر وقت مجھے ڈانٹتے رہتے تھے۔

ایک ہی سال کے اندر میری گود ہری ہو گئی، یعنی کہ میری مشکلات میں اور اضافہ ہو گیا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بچّہ، شوہر اور گھر ان تینوں کو کیسے سنبھالوں اور آئے گئے کی کیسے خاطر مدارات کروں۔ اتفاق سے میری پڑوسن جو گھر کے سامنے ہی رہتی تھیں، اپنا گھر اور اپنے بچّوں کو بہت صاف ستھرا رکھتی تھیں، ستم بالائے ستم تو یہ تھا کہ اس کے شوہر کی آمدنی ہم سے کم اور بچّے زیادہ تھے۔ میرے شوہر ہر وقت اس کی مثالیں

دے دے کر اور تعریفیں کر کر کے مجھے جلایا کرتے، اِدھر اپنا یہ عالم تھا، کہ اگر شوہر کی طرف دھیان دیتی، تو بچّہ گندہ رہتا اور بچّے کو دیکھتی تو گھر کا شیرازہ بکھر جاتا، آسانی کے لئے میں کھانے میں اکثر چٹنی روٹی یا کھچڑی چٹنی بنا لیتی۔ اگر میرے شوہر کبھی اچھے کھانے کی فرمائش کرتے تو بازار سے منگا لیتی۔ بچّے کا دودھ ایک ہی بار بنا کر ایک بڑے برتن میں رکھ لیتی اور دن بھر اسے شیشی میں بھر بھر کے دیتی رہتی، لیکن بہنو! اس چھوٹی سی بات کو لے کر میرا شوہر اکثر مجھ سے جھگڑا کیا کرتا۔ اب تم ہی بتاؤ اگر میرا بچّہ اور شوہر دونوں دُبلے ہوتے جا رہے تھے، تو میں کیا کرتی، میں خود کون سی موٹی ہو رہی تھی۔

میرے کپڑوں کو دیکھ کر تو میرے شوہر جل ہی جاتے۔ تم ہی بتاؤ پُرانے فیشن کے کپڑے اب کون پہنتا ہے، اور روز روز فیشن جو بدلتا رہتا ہے، اس میں میری کیا غلطی۔ ان کے بار بار کے کفایت شعاری کے سبق سے عاجز آ کر میں کم سے کم کپڑا خریدنے لگی تھی، جب کبھی میں اپنا کپڑا لاتی، بچّے کا کپڑا بھی اس میں تیار کر لیتی۔ اب تنگ ہو کر دونوں کے کپڑے پھٹ جائیں، تو میں کیا کروں۔ نئے فیشن کے ٹیڈی کپڑے تو پھٹتے ہی زیادہ ہیں میرے اس سلیقہ کو انھوں نے کبھی نہیں سراہا کہ بچّے کا کپڑا کبھی الگ سے نہیں خریدنا پڑتا۔ اور میں خریدتی بھی کیسے، پیسے بچتے ہی کہاں تھے۔

میرے شوہر جب صوفے پر لوٹا یا برتن، فرش پر کُشن اور کھانے کی میز پر بچّے کے گدّے اور کپڑے دیکھتے تو غصّہ سے آپے سے باہر ہو جاتے، وہ یہ کبھی نہیں سوچتے کہ یہ ساری کارستانی اس چھوٹے سے بچّے کی ہے، میری نہیں۔

ایک بات اور میرے شوہر کی سمجھ میں کبھی نہیں آتی، میرے گھر میں خوبصورت اور قیمتی چیزوں کی کمی نہیں تھی، لیکن میرے شوہر جب مسہریوں پر میلی چادریں، کُشنوں اور تکیہ کے غلاف داغدار اور چکٹ، فرنیچر پر دھول، الماریوں کے شیشوں اور آئینوں

پر گرد و غبار کی تہہ، باورچی خانے کے سامان کو تتر بتر، گھر میں مکھیاں بھنبھناتی ہوئی آنگن میں کوڑے کا انبار اور غسل خانے و پاخانہ میں کائی کی موٹی تہہ دیکھتے تو میرے اوپر برس پڑتے اور میرے لاکھ سمجھانے پر بھی نہیں سمجھتے، کہ یہ سب کام آیا، دھوبی، نوکر، باورچی اور بھنگی وغیرہ کا ہے۔ تصور تو سراسر میرے شوہر کا تھا کہ وہ مجھ اکیلی کو آیا، دھوبن، درزن، باورچن، بھنگن اور نہ جانے کیا کیا بنانے پر تلے ہوئے تھے، میری جب بھی ان سے اس بات پر بحث ہوتی، وہ ایک ہی جملہ میں اپنی بات ختم کر دیتے

"ایک سلیقہ شعار عورت یہ سب کچھ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہوتی ہے۔"

بتاؤ بہنو! کیا یہ سب کام میرے کرنے کے تھے، لیکن ان کی اس ہٹ دھرمی کا میرے پاس کیا علاج تھا۔

اس روز روز کے جھک جھک سے میں عاجز آچکی تھی۔ طرح طرح کی کتابیں لاتی انھیں پڑھتی اور اس کے مطابق کھانا پکانے اور گھر کو سجانے سنوارنے کی کوشش کرتی لیکن کیا کہوں، اپنی قسمت ہی کھوٹی تھی، ہر بار ایک آنچ کی کسر رہ جاتی۔

ایک بار ایسا ہوا کہ میرے شوہر کسی کام سے چند دن کے لئے شہر سے باہر گئے، میں نے سوچا موقع اچھا ہے، آزادی سے گھر کی پتائی صفائی وغیرہ کرا لوں۔ کفایت کے خیال سے پتائی جو کرائی تو صرف دیواروں پر، اور وہ بھی برآمدے میں پایوں تک اور کمروں میں دروازوں تک، اس کے اوپر کا حصّہ چھوڑ دیا۔ مستری نے لاکھ کہا کہ "بیگم صاحب پورے کمرے اور چھت پر پتائی کرا لیجئے"، لیکن میں کب اس کے جھانسے میں آنے والی تھی، وہ کم بخت اس بہانے اپنا کام بڑھا کر مجھ سے زیادہ پیسہ اینٹھنا چاہتا تھا۔

میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ گاہے بگاہے اگر کمروں کی ترتیب اور سجاوٹ کو بدل دیا جائے، تو اس کی خوبصورتی اور دلکشی بڑھ جاتی ہے، اس لئے پتائی کے بعد میں نے سارے کمروں کا سامان آنگن اور برآمدے میں نکالا، پھر اسٹور روم کو اپنی خواب گاہ اور

خواب گاہ کو اسٹور روم میں بدل دیا۔ ڈرائنگ روم کا سامان کھانے کے کمرہ میں سجایا، جو کہ باورچی خانہ سے ملا ہوا تھا اور کھانے کا کمرہ باہر کے کمرے یعنی ڈرائنگ روم کو بنا دیا۔ اب یہ نہ پوچھو کہ سامان اِدھر اُدھر کرنے میں مجھے کس قدر پریشانی ہوئی اور کتنے قیمتی برتن ٹوٹے پھوٹے، لیکن سب سے بڑی پریشانی مجھے جو اٹھانی پڑی وہ یہ تھی، کہ کھانے کی بھاری میز کس طرح دروازے سے نہیں نکل رہی تھی، میں نے سوچا کہ دروازہ چھوٹا ہے، اگر چوکھٹ کو تھوڑا تھوڑا کاٹ دیا جائے تو میز باہر چلی جائے گی۔ میں ڈھونڈ کر آری لائی اور چوکھٹ کو کاٹنا شروع کیا، دونوں طرف سے کافی حصّہ کاٹ دیا، پھر بھی میز باہر نہیں نکلی۔ اب میں نے سوچا کہ میز کافی چوڑی اور بڑی ہے، اور میرا خاندان مختصر، لہٰذا میز کو بھی ادھر اُدھر سے تراشنا شروع کیا، اس کوشش میں سن مائیکا کی پرت اُکھڑنے لگی، ہر چند کہ کنارے صفائی سے نہیں کٹ رہے تھے، لیکن میں اپنی دھن میں مست، کاٹتی رہی، لیکن میز اب بھی نہیں نکلی، اتفاق سے میری پڑوسن آنکلیں، میری پریشانی سن کر ہنسیں اور بولیں، میز کو یوں تھوڑے ہی نکالتے ہیں۔ انھوں نے میز کا ٹاپ اُٹھا کر الگ رکھ دیا۔ نچلا حصّہ میری مدد سے اٹھا کر باہر کے کمرے میں رکھا اور ٹاپ کو لے جا کر اس پر فٹ کر دیا۔ میں ان کی پھرتی اور صفائی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اگرچہ میں تھک کر پست ہو گئی تھی، لیکن صبح ہی میرے شوہر آنے والے تھے، اس لئے تمام رات جاگ کر تمام کمرے سجاتی رہی

صبح ہی صبح میرے شوہر آگئے، میں دوڑ کر ان کے پاس گئی اور بھاگ بھاگ کر سارے کمرے انھیں دکھانے لگی۔ رنگ تو ان کا گھر کے در و دیوار کو دیکھ کر ہی اڑ گیا تھا اور بجائے خوش ہو کر میری تعریف کرنے کے انھوں نے قہر بھری نظروں سے مجھے دیکھا میز اور چوکھٹ کو دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو گئے۔

چیخ چیخ کر مجھے بُرا بھلا کہتے ہوئے، غصّے میں بھرے ہوئے، بغیر کھائے پیئے اپنے کام پر چلے گئے۔ ان کے اس ناشکرے پن پر مجھے غصّہ تو بہت آیا، لیکن کیا کرتی، قہرِ بیوی بر جانِ بیوی۔

اس واقعہ کے بعد بھی میں نے ہمّت نہیں ہاری اور ایسے چھوٹے موٹے کارنامے اور جھگڑے ہوتے ہی رہے۔

جب سے میں اس گھر میں آئی تھی، پیپل کے ایک پودے کو دیوار کے ایک گوشے میں اُگا ہوا دیکھ رہی تھی، اب وہ پودا کافی بڑھ چکا تھا اور عنقریب پیڑ کی شکل اختیار کرنے والا تھا۔ میں نے کئی بار اپنے شوہر کی توجہ ادھر دلائی، لیکن انھوں نے کوئی دھیان نہیں دیا، آخر کار میں نے خود اسے نکالنے کا فیصلہ کیا۔

ایک دن جبکہ میرے شوہر اپنے کام پر جا چکے تھے، میں نے دیوار کے ساتھ بانس کی سیڑھی لگائی اور ہتھوڑا و چھینی لے کر وہاں پہنچی۔ پیپل کی جڑ اندر ہی اندر بہت دور تک پھیل چکی تھی، اُسے آسانی سے نکالنا ممکن نہ تھا، اس لئے میں نے دیوار کو توڑنا شروع کیا۔ دیوار کا ایک بڑا حصّہ توڑ دینے کے بعد بھی پیپل کی جڑیں ختم نہیں ہو سکیں ایکبار پیپل کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے ایک بھرپور ضرب دیوار کو جو لگائی تو ایک دھماکے کے ساتھ پوری دیوار مجھ کو لئے ہوئے گلی میں جا گری۔ پورا محلہ جمع ہو گیا۔ ایک لڑکا دیوار کے نیچے آ گیا، چوٹ تو مجھے بھی آئی تھی، لیکن لڑکے کی حالت ابتر تھی۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، پولیس آگئی۔ خبر پاکر میرے شوہر بھی آگئے لیکن بجائے اس کے کہ وہ مجھے بچاتے پولیس کے حوالے کر دیا اور کہا "جا کم بخت حوالات میں، تو اسی قابل تھی، اب لوٹ کر مجھے مُنہ مت دکھانا" ــــــ اب تم ہی بتاؤ بہنو! اس میں میرا کیا قصور تھا ذرا سی بات پر میرے شوہر نے مجھے نکال دیا۔

★★

دوپٹے سے پٹے تک

"اے ہے! یہ نگوڑا مارے دودھ کی ڈھائی گز کے دوپٹے تم سے نہیں سنبھلتے؟"

"غضب خدا کا، تمام مردوں کا سامنا ہو رہا ہے اور تمہارے سر پر دوپٹہ تک نہیں ٹکتا!"

"الٰہی خیر! یہ دوپٹہ ہے یا گلے کا ہار؟"

"اے بی بی سر پر دوپٹہ تو ڈالو!!"

یہ تیر ان جملوں میں سے چند ہیں، جو ہم بچپن سے لے کر آج تک دوپٹہ اوڑھنے کے سلسلے میں بطور ہدایت، تنبیہ اور سرزنش کے گھر کی بڑی بوڑھیوں سے کھاتے چلے آ رہے ہیں، اس لیے یہ تیر بھی بچپن ہی سے دوپٹے کی طرح چمٹ کر ہمیشہ ہمارے گلے کا ہار بنے رہے، خاص کر دادی اماں کی کڑی نظریں ہر وقت ہمارے دوپٹے کی نگرانی کرتی رہتیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم نے دادی اماں کا دوپٹہ ہمیشہ ان کے سرہانے رکھا پایا، جس کے ایک کونے سے وہ "پرس" کا کام لیتی تھیں اور خود عام طور پر دوپٹے سے بے نیاز صحن، آنگن یا لان میں گھوما کرتیں۔

گھر کی بزرگ خواتین کے نزدیک دوپٹے کا واحد مقصد سرپوشی ہے، اور اس کے تحت وہ احکامات صادر کرتی رہتی ہیں، لیکن جوں جوں ہماری عمر بڑھتی گئی، اس کے دوسرے مقاصد بھی معلوم ہوتے گئے۔ دوپٹے کے نت نئے فوائد کے آگے ہم نے اس کے اصل مقصد کو نظر انداز کر دیا، جسے ہماری نالائقی اور سرکشی سمجھا گیا۔ اب آپ ہی بتلائیے، جب اللہ میاں کی نازک... تھیں دوپٹے کے اتنے سارے مصرف سکھا دیئے

ہوں، تو پھر اس سے محض ایک ہی کام سر ڈھانکنا، جس سے بظاہر کوئی خاص تو کیا، عام فائدہ بھی نظر نہیں آتا، کیوں لیں۔

دوپٹے کا نام سنتے ہی آپ کی نظروں میں رنگ برنگے دوپٹے لہرانے لگے ہوں گے، نیلے پیلے، اودے ہرے، سُرخ و سبز، زرد و دھانی دوپٹے۔ شانوں سے ڈھلکتے، سروں سے پھسلتے ریشمی دوپٹے، کسی کے رُخ روشن کے گرد ہالہ کئے پاکیزہ دوپٹے آپ ہوں، ہم ہوں یا کوئی اور، دوپٹے کی مقبولیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ میرؔ کے زمانے میں بھی اگر دوپٹے اس طرح مقبول ہوتے تو ان کا شعر یوں ہوتا

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
ان دوپٹوں کے سب اسیر ہوئے

آج کل تو اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ گلیوں، سڑکوں، بازاروں، کلبوں، ہوٹلوں، کالجوں، سنیما گھروں اور کافی ہاؤسوں غرضیکہ ہر جگہ لہراتے، سرسراتے، اور جادو جگاتے نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات تو آدمی چکرا جاتا ہے کہ ترقی لڑکیوں نے زیادہ کی ہے، یا دوپٹوں نے، اور مقبول لڑکیاں زیادہ ہیں یا دوپٹے۔

دوپٹہ ململ کا بھی ہوتا ہے اور آب رواں کا بھی، نائلون کا بھی ہوتا ہے اور ڈیکرون، ٹیریلین اور شیفون کا بھی ہوتا ہے اور جالی کا بھی، چھینٹ کا بھی ہوتا ہے اور پاپلین کا بھی، غرضیکہ دُنیا کے ہر کپڑے کا دوپٹہ بنایا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے کوئی خاص کپڑا مخصوص نہیں ہوتا، گھر میں رکھی ہوئی مچھر دانی کی جالی کا بھی دوپٹہ بنا سکتی ہیں، اور پائجامہ قمیض کے کپڑے کو بھی کام میں لا سکتی ہیں، بلکہ کھادی تک کا دوپٹہ بنا سکتی ہیں۔

اس سلسلہ میں انار کلی، لیلیٰ مجنوں، آنکھ کا نشہ اور جھنک جھنک پائل باجے قسم کے دوپٹوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اول الذکر دوپٹوں کا ہونا تو

کچھ سمجھ میں آنے والی بات ہے بھی کہ شاید انارکلی نے اس کپڑے کا دوپٹہ اوڑھا ہو یا مجنوں نے لیلیٰ کو اس خاص کپڑے کا دوپٹہ بطور تحفہ پیش کیا ہو، لیکن آنکھ کا نشہ اور جھنک جھنک پائل باجے مار کہ دوپٹوں کی بات دل کو نہیں لگی۔

خیر، ناموں میں کیا رکھا ہے، کام دیکھیے۔ تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ دوپٹہ اپنے اندر وحدت میں کثرت کا اثر رکھتا ہے یعنی یہ ڈھائی تین گز کا ٹکڑا سینکڑوں کام سرانجام دیتا ہے، اس کا ایک فائدہ تو بہت پرانا ہے کہ یہ سر، کندھے اور جسم کے بالائی حصے کو اچھی طرح ڈھک سکتا ہے اور ضرورت پڑنے پر اُسے چادر کی طرح اوڑھ کر گھر سے بھی نکلا جا سکتا ہے۔ دن میں مکھیوں سے اور رات میں مچھروں سے بچنے کے لئے اُسے اوڑھ کر سویا جا سکتا ہے۔ ہوشیار خواتین باورچی خانہ میں صفائی کے لئے صافی رکھنے کی زحمت نہیں کرتیں، اور یہ کام بھی دوپٹہ سے لے لیتی ہیں۔ ادھر ہانڈی جلی یا دودھ اُبلا اور انھوں نے جھٹ دوپٹہ سے پتیلی اُتار لی۔ ہاتھ مُنہ دھونے کے بعد اب کون تولیہ تلاش کرتا پھرے، جھٹ دوپٹہ سے پونچھ لیا۔ ننھے کی ناک بہہ رہی ہو تو اُسے صاف کرنے کے لئے کوئی میلا یا صاف کپڑا تلاش کرنے سے آسان ان کے لئے دوپٹے ہی سے ان کی ناک پونچھ دینا ہے۔

پلیٹیں دوپٹے سے بہت آسانی سے پونچھی جا سکتی ہیں۔ شربت بنانے جلدی میں باریک کپڑا نہ ملے تو دوپٹے کے کونے سے فوراً شکر چھان لی۔ اس دوپٹہ کا ایک کونہ آپ کی چلتی پھرتی صندوقچی (پیسہ رکھنے والی) کا کام بھی دیتا ہے، جس میں پیسوں کے علاوہ چھوٹے موٹے ضروری کاغذات، بل اور سودے کا حساب وغیرہ گرہ میں بندھا ہوتا ہے، اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ نہ چوری کا اس کو کھٹکا، نہ چابی کھونے کا ڈر، نہ صندوقچی غائب ہونے کا خوف۔ چابی کی بات پہ یاد آیا، کہ چابیاں کھویا بہت کرتی ہیں، اس لئے اسے بھی ایک کونے میں باندھ لیا جائے تو وہ محفوظ بھی

رہیں گی، اور دوپٹے کی افادیت میں چار چاند لگ جائیں گے۔ دوپٹے کا آنچل جھاڑن کا کام بھی خوب دیتا ہے۔ گھر گرہست خواتین دوپٹے سے میز کرسیاں اور ان کے شوہر اپنے چشمے کے شیشے صاف کر لیا کرتے ہیں، کبھی کبھی یہ بزرگوں کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچانے میں بڑی مدد دیتا ہے، مثلاً بڑوں کے سامنے اگر ہنسی رکے نہ رکے تو منہ میں دوپٹہ ٹھونس کر کھی کھی ..... کی آواز کو بخوبی روکا جا سکتا ہے اس طرح احساسِ ندامت یا اظہارِ شرم کے لئے دوپٹے کے کونے کو انگلی میں لپیٹنے کے مزے کا تو جواب نہیں۔ سوچتے وقت اگر اس کا کونہ منہ میں دبا لیا جائے تو دماغ تیزی سے کام کرنے لگتا ہے۔

دو دلوں کو باندھنے کے لئے بھی دوپٹہ کی گرہ حرفِ آخر سمجھی گئی ہے آپ نے بھی مار دھاڑ والی فلموں میں دیکھا ہوگا یا کہانیوں میں پڑھا ہوگا کہ کس طرح کسی نوجوان اجنبی کے زخمی ہونے پر اچانک پردہ غیب سے ایک حسینہ نمودار ہوتی ہے اور بلا کچھ سوچے سمجھے دوپٹہ کی ایک لمبی چٹ پھاڑ کر اس کے پٹی باندھ دیتی ہے اور پٹی کی گانٹھ کے ساتھ دو دل بھی بندھ جاتے ہیں۔ دوپٹہ بدل کر بہن بنانے کا رواج پہلے بہت تھا، مگر خراب دوپٹے کے بدلے اچھے دوپٹے اینٹھ لینے کی وجہ سے یہ رسم دن بہ دن کم ہوتی جا رہی ہے۔

دوپٹہ کی ایک قسم اور بھی ہوتی ہے اور وہ ہے رسّی کی طرح بٹی ہوئی اوڑھنی جسے عرف عام میں چنا ہوا دوپٹہ کہتے ہیں۔ یہ دوپٹہ گلے کا ہار بنا رہتا ہے۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے کسی طرح کی لاپرواہی نہیں برتی جا سکتی، کیوں کہ گلے کا ہار جو ٹھہرا۔ یہ ہار ضرورت پڑنے پر پھانسی کے پھندے کا کام بھی دے سکتا ہے، اس کی اس خصوصیت کا ہمیں پچھلے ہفتے پتہ لگا جب پڑوس کی ایک ناکام محبت لڑکی نے اپنے دوپٹے سے پھانسی لگا کر اپنی محبت کے افسانے کو اچھا خاصا اسکینڈل

بنا دیا امتحان میں ناکامی، محبوب کی بے وفائی، محبت میں ناکامی، احساس حماقت کے بعد اور جہیز کا مطالبہ پورا نہ کر سکنے کی صورت میں اکثر لڑکیوں کو خودکشی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس صورت میں ان بے چاری لڑکیوں کے لئے دوپٹہ کا نسخہ بہت آسان ہے، کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے۔

ہمیں افسوس ہے کہ دوپٹہ جیسی نعمت سے اکثر ملکوں کی خواتین محروم ہیں افسوس تو ان مشرقی میم صاحبات پر بھی ہے جو اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانا پسند نہیں کرتیں، اور بقول نانی اماں کے "کم بختیں ننگی بُچّی گھوما کرتی ہیں" اور اس سے زیادہ افسوس ان فیشن ایبل لڑکیوں اور لیڈیوں پر ہے جنھوں نے اس کا طول و عرض کم کرتے کرتے اسے دوپٹے سے پٹہ بنا دیا ہے اور جس کا عرض گھٹاتے گھٹاتے ایک بالشت بلکہ چار انگل تک پہنچا چکی ہیں۔ جس طرح چوٹی کے مقابلے میں "پٹے" فیشن میں آتے تھے اسی طرح اب دوپٹہ کی جگہ پٹہ (کتے یا بلی کا نہیں) لے رہا ہے لیکن اس سے نہ تو سر پوشی کا کام لیا جا سکتا ہے اور نہ ستر پوشی کا، اور نہ ہی ہزاروں دوسرے فائدے اٹھائے جا سکتے ہیں، اس سے دوپٹے کا مقصد بھی پورا ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ بحث بھی اب آوٹ آف ڈیٹ ہو چکی ہے، اس لئے اسے چھوڑیئے، کیوں کہ ہمیں تو کام دیکھنا ہے، اور اس کا کام بھی کسی حالت میں دوپٹہ کے کاموں سے کم نہیں، اس کا رنگا رنگ کام بھی دیکھئے۔

یہ ایجاد کیوں کیا گیا، اس کی ایک وجہ ہماری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ اس سے مرہم پٹی کا کام بہت آسانی سے لیا جا سکتا ہے۔ لڑکیاں اب گھروں میں بیٹھ کر چوٹھے چکّی میں پڑنا پسند نہیں کرتیں، اور ناک میں نتھ کی نکیل پڑنے تک کھیل کود، پکنک، آوٹنگ وغیرہ میں انھیں لڑکوں کے برابر سوریج اور مساوات کا درجہ حاصل ہے، اس لئے ہاتھ پیر ٹوٹنے یا موچ آنے کی صورت میں یہ دوپٹہ بڑا کام آتا ہے۔ ادھر کھیل کود یا دھینگا مشتی میں کسی لڑکی کی

ہڈی پسلی ایک ہوئی اور محبت دوپٹہ سے بینڈیج کا کام لے لیا گیا۔

اس دوپٹہ کا ایک مفید اور عام استعمال آنکھ مچولی کے دوران آنکھوں پر پٹی باندھنا ہے۔ اسکیپنگ کے لئے بھی یہ بے حد موزوں ہے۔ اگر وقت پر سامان باندھنے یا بستر باندھنے کے لئے رسّی نہ مل سکے، تو یہ کام بھی دوپٹہ بخوبی انجام دے سکتا ہے، اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ اتنا ہلکا پھلکا ہوتا ہے کہ اس کا جسم پر ہونا نہ ہونا برابر ہے، اس کا بنانا اس قدر کم خرچ بالانشیں ہوتا ہے کہ جمپر یا پاجامہ کا کپڑا بچا کر اسے تیار کیا جاتا ہے۔ اس گرانی کے زمانہ میں اس طرح کافی کم خرچ یا بالکل ہی خرچ نہ کر کے اسے بنایا جا سکتا ہے۔

لیجئے، اپنے تجربات بتاتے بتاتے نہ جانے کب میرا دوپٹہ شانوں سے پھسل کر گود میں آگیا اور خالہ جان کی چیختی ہوئی آواز آرہی ہے "توبہ! اس جیسی کوئی بے خبر لڑکی ہو جسے آج تک دوپٹہ اوڑھنے کا ڈھنگ نہ آیا۔"

مانگے کا چکّر

کہتے ہیں ملا نصیر الدین کے ایک پڑوسی نے ان سے ہوا خوری کے لئے ان کا گدھا مانگا۔ ملا، پڑوسی کے مانگنے کی عادت سے عاجز آچکے تھے، لہٰذا یہ کہہ کر ٹال دیا کہ گدھا ایک اور صاحب مانگ کر لے گئے ہیں۔ ملا کی بدقسمتی سے اسی وقت گدھا رینکنے لگا۔ پڑوسی گدھے کی آواز سن کر غصّے میں بولا۔

"ملّا! بڑھاپے میں جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی۔ تمھارا گدھا خود تمھارے خلاف گواہی دے رہا ہے۔"

ملّا بڑے اطمینان سے بولے۔

"ملّا ایسے شخص کے ساتھ بحث نہیں کر سکتا، جو آدمی کی بجائے گدھے کی آواز پر اعتبار کرے۔"

مانگنے والوں نے تو حد کردی، کہ ہاتھ اور ٹانگ تک مانگ لیتے ہیں۔ پہلی بار جب ہم نے سنا کہ لڑکی دلڑکے منگے ہوئے ہیں، تو بڑا تعجب ہوا۔ لیکن اس سے زیادہ تعجب ھٹیکرے کی مانگ سن کر ہوا۔ خیر، یہ تو مانگوں کا زمانہ ہے اور انھیں "ہماری مانگیں پوری ہوں" نے سرکار، سرمایہ داروں، افسروں سے لے کر پیارے عوام تک سب کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ کوئی صوبہ مانگتا ہے تو کوئی بجائے کیک کے روٹی مانگتا ہے — غرض ہر مانگ مردہ باد سے شروع ہو کر زندہ باد پر ختم ہوتی ہے۔ پھر بھی یہ مانگیں پوری نہیں ہوتیں اور نہ پوری ہوں گی۔

ہمیں ان مانگوں پہ کوئی اعتراض نہیں، لیکن وہ مانگیں جو بجلی بن کر خانہ

انوری یعنی غریب خانہ پر گرتی ہیں، انھوں نے ہمارا بیڑا غرق کر رکھا ہے۔

اب آپ بتایئے کہ ہم بڑے شوق سے ایک بہت قیمتی اور خوب صورت ٹی سیٹ خرید کر لائے۔ ہماری ماما کی عنایت سے محلے بھر میں اس کے آنے کے ڈنکے بج گئے۔ ابھی ہم اُسے کھانے کے کمرے میں سجا کر رکھ بھی نہ پائے تھے، کہ بیگم فکری کے یہاں سے اس کی مانگ آگئی۔ ہم نے فوراً ملا نصیر الدین کا حربہ آزماتے ہوئے کہا:

"ٹی سیٹ منگنی گیا ہوا ہے۔"

ملازم کورا جواب لے کر گیا تو دھم سے بیگم فکری نازل ہو گئیں اور ہنستے ہوئے بولیں "بھئی میں نے آپ کا ٹی سیٹ منگوایا تھا۔"

میں نے دل کڑا کر کے کہا "افسوس کہ وہ ایک اور صاحبہ مانگ کر لے گئی ہیں۔"

مگر وہ کہاں ماننے والی تھیں۔ فوراً سوالات کی بھرمار شروع ہو گئی۔

"کس کے یہاں گیا ہے؟ کب گیا؟ کب تک آجائے گا؟" وغیرہ وغیرہ۔

"جی! وہ! وہ! بیگم .....!" میں ہکلانے لگی۔

"آخر کس کے یہاں؟" بیگم فکری نے دوبارہ جرح کی۔ ملا نصیر الدین کا لطیفہ میرے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ یاد آیا، کسی گدھے کا ذکر بھی اس میں تھا، لہذا جھٹ بول اُٹھی ــــ "وہ ایک گدھی کے یہاں۔"

"جی، کس کے یہاں؟ کہیں آپ کی مراد بیگم حمیدی سے تو نہیں۔"

"ہاں ہاں! خوب یاد دلایا، ان ہی کے یہاں آج صبح منگوالیا گیا تھا۔"

"لیکن وہ تو دو ہفتے سے مع اپنے کنبے کے اپنے میکے گئی ہوئی ہیں۔ میرے پڑوس میں تو رہتی ہیں۔ اب تک ان کے آنے کی خبر نہیں ملی۔"

پھر مجھے حیران اور شرمندہ دیکھ کر بولیں۔

"اجی چھوڑیئے بھی بہانے! میں نے بُرا تھوڑی مانا ہے۔ بس اب جلدی سے

ٹی سیٹ نکال دیجیے۔ کسی کے وقت پر کام آنا تو ثوابِ عظیم ہے۔"

یہ ثوابِ عظیم کمانے اور خاصی بھاگ دوڑ کے بعد مجھے ملا کیا وہ بھی سن لیجئے۔

ایک لولا لنگڑا ٹی سیٹ جس کی طشتریاں تقریباً غائب ہو چکی تھیں۔ دو پیالیاں کُنڈوں کی جدائی کے صدمے سے نڈھال تھیں۔ شکردان کا ڈھکن داغِ مفارقت دے چکا تھا۔ اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں، کہ بیگم حمیدی کے ساتھ کیسا معرکۂ عظیم ہوا کہ میں نے نادانستہ طور پر گدھی جو کہہ دیا تھا۔

گذشتہ ہفتے کی بات ہے، بیگم " د " گھبرائی ہوئی پہنچیں۔

"بہن ابھی ایک ٹی پارٹی میں جانا ہے، کل جو بلاؤز آپ سی رہی تھیں، خوش قسمتی سے اس کا رنگ میری نئی ساڑھی سے میچ کرتا ہوا ہے، جلدی میں میرا بلاؤز نہ مل سکا، بڑی مہربانی ہوگی اگر چند گھنٹوں کے لئے مجھے دے دیں۔"

میں نے ان کے غیر معمولی تن و توش کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن آپ کے وہ آ بھی جائے گا؟"

"کیوں نہیں! کیوں نہیں! مجھ میں آپ میں بس کوئی انیس بیس کا فرق ہوگا، آپ مجھ سے کوئی زیادہ موٹی تو نہیں۔"

اس انیس بیس کا اسی طرح کوئی جواب نہیں جیسے ان کے ساڑھے تین من کی جسامت کا۔ ٹی سیٹ کے سلسلے میں بہلانے بازی کا تلخ تجربہ مجھے ہو چکا تھا لہٰذا خاموشی سے بلاؤز نکال کر دے دیا۔ لیکن جب بلاؤز واپس آیا تو معلوم ہوتا تھا کہ یہ بلاؤز کسی پارٹی میں نہیں، بلکہ کسی دنگل میں شرکت کے لئے مانگا گیا تھا، اور اس کو پہننے والی نے غالباً حمیدہ پہلوان سے معرکۃ الآرا کشتی لڑی تھی۔ شیپ کا تو کہیں ٹھکانا نہیں تھا۔ جگہ جگہ سے بخیہ ادھڑی ہوئی، کہیں سے مسکا ہوا، کہیں داغدار، پھر پاؤڈر، سینٹ اور پسینہ کی ملی جلی بو نے ایک نیا عطر مجموعہ پیدا کر دیا تھا۔

اسی طرح ایک بار میں نے اپنا بیگ پڑوسن کے یہاں سے واپس منگوایا۔ ملازم خالی ہاتھ واپس آگیا۔

"جی! وہ کہتی ہیں بیگم فخرو کے یہاں منگوا لیا گیا ہے۔ واپس منگوانے کے لئے نوکر کو بھیجا ہے۔"

شام کو پھر ملازم کو بھیجا معلوم ہوا کہ بیگم فخرو کے یہاں سے شریمتی بھاگیہ وتی لے گئی ہیں، کل صبح تک واپس مل جائے گا۔ صبح آدمی بھیجا تو معلوم ہوا کہ ان کی پڑوسن مسز فرینکلن لے گئی ہیں۔

شام کو پتہ چلا کہ مسز ڈگّل کے یہاں پہنچ چکا ہے۔ غرضیکہ ملازم کے پورے شہر میں محلّہ محلّہ چکر لگانے اور غریب کی سائیکل کے ٹائر ٹیوب اور جوتے گھس جانے کے بعد پتہ چلا کہ اس کا شیشہ ٹوٹ چکا ہے، اسکرو ڈھیلے ہو چکے ہیں، اور کیک تو کیک اس پر اپنا دل بھی بیک کر کے کباب نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دن اور آج کا دن، وہ مُردہ یا زندہ کسی حال میں پکڑ کر نہ لایا جا سکا۔

کہتے ہیں کتابیں دینے والا احمق، اور مانگی ہوئی کتاب واپس کرنے والا اس سے بھی بڑا احمق، چنانچہ میری اس حماقت (جسے آپ مروّت بھی کہہ سکتے ہیں) کی نذر میری لائبریری ہوتی جا رہی ہے، کتابیں مانگ کر پڑھنا ہماری روایتی شان ہے اور ان کا پوسٹ مارٹم کرنا ہمارے بچّوں کا پیدائشی حق۔ کتابیں لے جانے کے بعد اگر کوئی از راہ حماقت واپس کر بھی جاتا ہے، تو اس صورت میں کہ کتاب "نہ اس کی ابتدا معلوم، نہ انتہا معلوم" کی مکمّل تفسیر ہوتی ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ ہماری لائبریری کے در و دیوار اور فرنیچر زبانِ حال سے یہ شکایت کرتے نظر آتے ہیں، کہ لوگ کتابیں لے گئے ہیں، اب ہمیں بھی انھی کے پاس بھجوا دیجئے، اس پر مجھے لائبریری والا وہ لطیفہ یاد آ رہا ہے کہ ایک صاحب نے ایک لائبریری کی اتنی کتابیں چرائیں کہ رفتہ رفتہ وہ لائبریری کی ساری

کتابیں چُرا کر اپنے گھر لے آئے۔ خالی لائبریری کے لائبریرین کا نوکر ایک دن ان کے گھر آیا اور ان کے زندگی بھر کے مانگے ہوئے اور چوری کئے ہوئے سرمائے یعنی ان کی خود ساختہ لائبریری کو دیکھنے کے بعد کہنے لگا۔

لائبریرین صاحب نے کہا ہے کہ اگر اجازت ہو تو لائبریری کی الماریاں اور سائن بورڈ بھی آپ کے گھر پہنچا دیا جائے۔"

مانگنے والوں کی نہ کہیئے۔ کہتے ہیں کہ امریکی خانہ جنگی کے دوران ابراہم لنکن نے اپنے حریف میکلن کو لکھا تھا:

"اپنی فوج آپ چند دنوں کے لئے مجھے مستعار دے دیجئے، میں اسے استعمال کرنے کے بعد آپ کو واپس کر دوں گا۔"

غرض دنیا میں کوئی ایسی گھر گرہستی کی چیز نہیں جو مانگنے کی مصیبت کا نشانہ نہ بنے، جس کی وجہ سے ہمارے گھر کا اب یہ عالم ہے کہ ادھر میں باورچی خانہ میں گئی اور باورچی سے اس قسم کے ڈائیلاگ شروع ہو گئے۔

"ارے وہ توس کاٹنے والی چھری کیا ہو گئی؟"

"جی، وہ سدھا بہن کا بیرا لے گیا۔"

"کئی دن سے Egg Brater کا پتہ نہیں؟"

"وہ تو کب کا خالدہ بیگم کی آیا لے گئی۔"

"یہ کدو کش کیسے ٹوٹ گیا؟"

"جی، یہ تو فضیحتا خانم کے یہاں سے ٹوٹا ہوا آیا تھا۔"

"پریشر کوکر کدھر ہے؟"

"جی وہ بغل والی کے کچن میں ہے۔"

اسی پر بس نہیں، کسی کے یہاں سلائی مشین، کہیں ٹیبل فین، کہیں قالین،

تو کہیں صوفہ سیٹ منگنی گیا ہوا ہے، اب تو گھر کا یہ حال ہے کہ صوفہ کی ایک ٹانگ غائب، قالین کے روئیں ایسے غائب کہ خارش زدہ معلوم ہوتا ہے۔ مشین اور ٹیبل فین مرمت کے لئے بازار میں۔ پلنگ پوش اور میز پوش ایسے داغدار کہ لانڈری والا بھی ہاتھ جوڑ چکا ہے۔ باورچی خانے میں چولھے کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ہر چیز پرانی پھٹی یا پیوند لگی نظر آتی ہے اور مانگنے والے الگ خفا ہیں کہ مہمانوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑتا ہے اور میں نئی چیزیں نہیں خریدتی۔

قصہ مختصر، آئے دن کے مانگنے کی مصیبت نے اب مجھے بھی کچھ ڈھیٹ بنا دیا ہے۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ میں اپنے لان میں ٹہل رہی تھی اور مالی گھاس کاٹ کر برابر کر رہا تھا۔ ہماری نئی گھاس کاٹنے کی مشین کی خوشبو پا کر جب ہمارے ایک پڑوسی ہمارے پاس آئے اور اپنے لان میں جنگل کی طرح بڑھی ہوئی گھاس کا رونا رونے کے بعد کہنے لگے۔

"کیا میں اسے استعمال کر سکتا ہوں؟"

تو میں نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ کہا۔

"ضرور! ضرور!! بڑے شوق سے، لیکن صرف اس شرط پر کہ آپ اسے یہیں استعمال کریں۔"

بڑا آدمی بننے کا گُر

ایک پُرانا لطیفہ ہے، ایک بار کسی نے ایک بچّے سے پوچھا "تمھارے شہر میں کون کون سے بڑے آدمی پیدا ہوئے ہیں؟" بچّے نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

"ہمارے یہاں کوئی شخص بڑا نہیں پیدا ہوتا، سب بچّے پیدا ہوتے ہیں۔"

کہنے کو تو یہ ایک لطیفہ ہے اور اسے سن کر سب ہنس بھی دیتے ہیں، لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ کوئی آدمی "بڑا" نہیں پیدا ہوتا، کچھ لوگ تو خود بڑا بننے کی کوشش کر کے بڑے بن جاتے ہیں۔ کچھ کو کچھ لوگ مل کر بڑا بنا دیتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بڑا بننا کوئی خاص مشکل نہیں۔ ہم اور آپ بھی کوشش کر کے بڑے بن سکتے ہیں۔ اگر واقعی آپ بڑا آدمی بننا چاہتے ہیں تو ذیل کے اصولوں کو کام میں لایئے، اور وہ دن دور نہیں جبکہ آپ کا شمار بھی بڑے لوگوں میں ہونے لگے گا۔

بڑا آدمی بننے کے لئے سب سے پہلے آپ یہ یاد رکھیئے کہ آپ کہیں بھی وقت پر نہ پہنچیں، کیوں کہ اس کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ وہ کہیں بھی وقت پہ نہیں پہنچتا، چاہے اسے تقریر کرنی ہو، افتتاح کرنا ہو، صدارت کرنی ہو، اپنی کہانی یا کلام سُنانا ہو، انتظار کرانا اس کا پہلا اصول ہے، بے شمار لوگوں کو اپنا چشم براہ دیکھ کر آپ بھی اگر جذبۂ تفاخر حاصل کرنا چاہتے ہیں تو وقت پر پہنچنے والی گھٹیا حرکت ہرگز نہ کیجئے۔

کسی بھی بڑے آدمی کی چال ڈھال، رہن سہن، اُٹھنے بیٹھنے کی عادتوں کو اپنا لینا بھی کبھی کبھی بڑا کام دیتا ہے۔ اگر بڑائی میں اس ہستی تک نہ پہنچ سکے تو غم نہیں، اس کے عادات واطوار اپنا لئے تو سمجھ لیجیئے کہ آپ آدھے بڑے آدمی تو ہو ہی

گئے۔ ہزاروں نوجوان ہیرو بننے کی آرزو میں ہیروؤں جیسی چال ڈھال بنا لیتے ہیں۔ ہم نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ بہت سے لوگ سگار محض اس لئے پیتے ہیں کہ چہرے پر چرچل جیسی مدبرانہ شان پیدا ہو سکے، شیروانی اس لئے پہنتے ہیں کہ جواہر لعل پہنتے تھے۔

آپ اپنے گھر بار کی بالکل پروا نہ کیجئے۔ چھوٹے لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کی زیادہ فکر کرتے ہیں اور اپنے چھوٹے سے گھر اور خاندان کو اچھے سے اچھا بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اگر اس میں کامیاب ہو گئے، تو سکھ اور چین کی بنسی بجاتے ہیں، لیکن بڑا آدمی کبھی ان چھوٹی باتوں میں نہیں پڑتا، اسے سدا ایک بڑی الجھن چاہیئے تو بس آپ بھی آج ہی سے گھر سے بے پروا ہو جایئے۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے، کون مرا؟ کون جیا؟ اس سے آپ کو کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیئے۔ بچے اگر امتحان میں فیل ہوتا ہے تو ہوا کرے، بیوی اگر بیمار پڑتی ہے تو پڑا کرے، ویسے بھی یہ ایک اچھی نشانی ہے کیونکہ بڑے آدمی کی بیویاں زیادہ تر بیمار ہی رہا کرتی ہیں۔ آپ کا کام صرف بڑی باتوں پر دھیان دینا ہے۔ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کے لئے بڑا تاجر بننا، سماجی کاموں میں لگ کر بڑا مصلح بننا، بڑا لیڈر یا بڑا افسر کار بننا، ملک اور قوم کی خدمت کرتے آپ یہ بالکل بھول جایئے کہ آپ کے گھر والے بھی اس قوم اور ملک کی گنتی میں آتے ہیں۔

گھر بار کی فکر تو دور کی بات ہے، آپ کو تو اپنے آپ کو بھی بھول جانا پڑے گا کھانے پینے کی کوئی فکر نہ کیجئے۔ رات کو دیر سے گھر پہنچیے، ہر کھانا مقررہ وقت سے تین چار گھنٹے بعد کھایئے، یعنی صبح کا ناشتہ دوپہر میں، دوپہر کا کھانا رات کو اور رات کا کھانا صبح، اگر آپ کہیں کھانے یا ٹی پارٹی میں مدعو ہیں، تو اشتہا اور بھوک کے باوجود کھانے کی چیزوں کو محض چکھتے رہیئے، تاکہ کھانے والوں اور کھلانے والوں دونوں کی توجہ کا مرکز بنے رہیئے۔ یاد رکھیئے، بے تکلف کھانے پینے والوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔

اس طرح ہر ایک کی کوشش یہی ہوگی کہ باری باری آپ کی پلیٹ میں کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز ڈالتا چلا جائے اور وہ چیزیں پہاڑ کی شکل اختیار کرتی چلی جائیں۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ دھیرے دھیرے ان میں سے بہت سی چیزیں کھا لینے کے بعد بھی پہاڑ اپنی جگہ اور آپ کی بات اپنی جگہ پر قائم رہے گی، کہ آپ کچھ نہیں کھاتے صرف ہوا کھا کر رہتے ہیں۔

اتنا ہی نہیں، آپ کو بھلکڑپن کی عادت بھی اپنانا پڑے گی۔ خدانہ خواستہ اگر آپ میں یہ عادت نہیں تو ڈال لیجئے۔ مثلاً یہ کہ جان بوجھ کر اپنی چھوٹی موٹی چیزیں (بڑی نہیں) رومال، قلم، عینک، چابی (اگر اس کی ڈپلی کیٹ آپ کے گھر میں ہے) چھتری وغیرہ کہیں نہ کہیں بھول کر چھوڑتے رہیے۔ اس کے بدلے آپ کسی کی کوئی بڑی اور بیش قیمت چیز اپنے ہاتھ یا جیب میں ڈال کر آسانی سے گھر جا سکتے ہیں، اس سے آپ کی بڑائی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، کیونکہ آپ بھلکڑ جو ٹھہرے۔

اگر آپ کوئی بڑا فن کار بننا چاہتے ہیں تو فن کے پیچھے تو بعد میں بھاگئے، پہلے اپنی زندگی کو بے ڈھنگے پن اور بے اصولی کے سانچے میں ڈھالیئے۔ آپ کے رہنے کے کمرے اور مطالعہ کے کمرے میں ہر وقت ایک بے ڈھنگا پن اور گندگی پھیلی ہو، اگر آپ کے جوتے میز پر، موزے پلنگ پر، تولیے زمین پر اور ملبوسات مسہری کے ڈنڈے اور کرسیوں پر رکھے ہوں اور میلے کپڑے الماری میں ہوں یا شیلف پر، ایکدوسرے سے دست وگریبان ہوں۔ قلم کھلے اور دوات اُلٹی پڑی ہو۔ اگر آپ کے اندر یہ سب باتیں ہیں تو بس سمجھ لیجئے، کہ آپ کے اندر فن کار بننے کے جراثیم موجود ہیں بس اب ضرورت فن کی ہے، تو کوشش سے وہ بھی مل جائے گا۔

عام طور سے بڑا آدمی بہت کم ہنستا ہے اور بہت بڑا آدمی تو بالکل نہیں ہنستا۔ ہمارا دانشور سنجیدگی کو زیادہ پسند کرتا ہے، اس لئے آپ بھی اپنے چہرے پر

سنجیدگی ہی کا نہیں، بلکہ رنجیدگی کا ایک خول چڑھا لیجئے۔ قہقہہ لگا کر ہنسنا تو آپ کے لئے سم قاتل ہے، اگر چھوٹے لوگ خوب زور زور سے ہنس رہے ہوں تو ان کے قہقہوں پر مت جایئے ان کا آخر کام ہی کیا ہے، بے تکی اور بیوقوفی کی باتوں پر دل کھول کر ہنسنا، اور خوش ہونا۔ آپ تو بس اپنی عادت ایسی بنا لیں کہ جب آپ کسی بات پر مسکرائیں تو وہ سند بن جائے اس بات کی، کہ واقعی یہ بات تھی قہقہہ آور، کہ فلاں بڑا آدمی بھی اس بات پر مسکرا دیا تھا۔

آپ کسی کام کو کر دینے یا کرا دینے کا وعدہ تو ضرور کیجئے لیکن ایفا ہرگز نہ کیجئے کسی بھی وعدے کو پورا کرنے کے لئے وعدہ کئے گئے شخص کو آپ اپنے بھلکڑپن کو کوستے ہوئے بار بار دوڑا سکتے ہیں اور اس کے بدلے میں اس سے بہت سے کام لے سکتے ہیں۔ بعد میں تمام تفصیلات نوٹ بک میں لکھ لینے کے بعد وہ نوٹ بک ہی کہیں رکھ کر بھول جانے کا بہانہ بہت آسانی سے کر سکتے ہیں، کیوں کہ بھول جانا آپ کی عادت جو ٹھہری، اس طرح اپنے نام آئے ہوئے ضروری خط، یہاں تک کہ تار تک کا جواب نہ دیں۔

کسی بھی چیز پر جھٹ سے اپنی پسند یا ناپسندیدگی کا اظہار مت کیجئے۔ بڑائی اسی میں ہے کہ زیادہ چیزوں کو ناپسند کیجئے۔ اس بات کا پورا دھیان رکھیئے، کہ جب کوئی شخص آپ سے ملنے آئے، تو پہلی ہی بار میں نہ مل لیجئے۔ دو چار بار اسے دوڑا لینا ضروری ہوگا۔ ہو سکے تو اپائنٹمنٹ ہو جانے کے بعد بھی دو چار چکر اپنے گھر کے لگوا لیجئے۔ اچانک اور پہلی ہی بار مل لینا آپ کی شان کے خلاف ہوگا، اس لئے تو زیادہ تر بڑے آدمیوں کے گھر میں ایک پھاٹک، ایک لان، ایک برآمدہ، تب ڈرائنگ روم یا ملاقاتی کمرہ ہوتا ہے۔ ڈرائنگ روم تک پہنچنے کے لئے ہر چھوٹے آدمی کو کئی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس کی سب سے پہلی ملاقات دربان یا کتے سے ہوتی ہے، دوسری چپراسی یا کال بیل سے، پھر ملاقاتی کمرے کے فرنیچر یا رسائل و اخبارات

سے ہوتی ہے، تب کہیں جا کر وہ اس بڑے آدمی سے شرف ملاقات حاصل کر سکتا ہے۔ اب یہ اس شخص کی قسمت جانے کہ ایک ہی جست میں وہ یہ تمام منزلیں طے کر لے یا اسے پار کرنے میں ہفتے، مہینے یا سال لگ جائیں۔ آپ اس بات کی فکر نہ کریں کہ آپ کے گھر میں یہ منزلیں نہیں ہیں، آپ کو تو ضرورت مندوں کو محض دوڑانا ہے اس لئے کسی نہ کسی بہانے انھیں دوڑاتے رہیئے۔

تو یہ ہیں وہ چند "زرّیں اصول" جن پر چل کر آپ "بڑا آدمی" بن سکتے ہیں، بس کوشش و ہمّت شرط ہے۔